قدیم اردو

ڈاکٹر عبدالحق

★

انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو روڈ ۔ کراچی ۱۰

قدیم اُردو

از

ڈاکٹر عبدالحق

(شائع کردہ)

کُل پاکستان انجمن ترقّی اُردو۔ اُردو روڈ

کراچی

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان نمبر ۲۹۵

اشاعت اوّل ۱۹۶۱ء

تعداد .. .. ایک ہزار

طابع .. .. انجمن پریس کراچی

قیمت .. .. پانچ روپے پچاس پیسے

حرفے چند

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ کی تحریروں کا زیادہ حصہ مضامین کی صورت میں مختلف رسالوں میں منتشر ہے۔ سر سید رح سے متعلق مضامین کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں بقیہ مضامین کو بھی موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا جارہا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں صرف وہی مضامین شامل کئے گئے ہیں جن کا تعلق اردو کے قدیم سرمائے سے ہے۔ ان مضامین کا کتابی صورت میں شائع ہونا اس لئے ضروری ہے کہ بعض اہم شعراء کے حالات اور بعض نادر تصانیف کے بارے میں مفصل معلومات جو اس کتاب میں ہیں وہ کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوئیں۔

یہ تمام مضامین رسالہ ''اردو'' میں شائع ہوچکے ہیں۔ تاریخ اشاعت ہر مضمون کے آخر میں درج کردی گئی ہے۔ بعض مضامین میں سے چند عبارتیں حذف کردی گئی ہیں جن کی موجودہ تحقیقات کی روشنی میں ضرورت نہ تھی۔

اگرچہ اس کتاب کی کتابت پر خاص توجہ دی گئی ہے لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کتابت کی غلطیاں نہ ہوں گی کیونکہ جا بجا قدیم اردو کے اشعار اور نثری عبارتوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جنہیں صحیح طور پر لکھنا اور پڑھنا آسان کام نہیں۔ بابائے اردو مدظلہ نے اس کتاب کے پروف خود پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ یہ کام کرنے سے معذور ہیں۔ بہر حال حتی الامکان کوشش یہی کی گئی ہے کہ کوئی غلطی باقی نہ رہے۔

مرتب

۷ جون ۱۹۶۱ع

(ناظم مطبوعات انجمن ترقی اردو)

فہرست مضامین

بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان

★ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق

★ حضرت شاہ برہان الدین جانم

★ حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ

حضرت شاہ میران جی شمس العشاق

بیجاپور دکن کے اُن مشہور اور شاہی شہروں میں سے ہے جو اپنی شان وشوکت اور عمارتوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے. شاید دلّی کے بعد ہندوستان کے کسی شہر میں اس قدر اسلامی یادگاریں اور عمارتیں نہ ہوں گی جتنی اس شہر میں ہیں. یہ عادل شاہی بادشاہوں کا مستقر تھا جو علم کی قدر دانی اور فنونِ لطیفہ کے ذوق میں خاص شہرت رکھتے تھے. اُن کے پاکیزہ مذاق کے نشان اس شہر میں قدم قدم پر ملتے ہیں جو اُن کے اعلیٰ تمدن، ذوقِ سلیم اور شان وعظمت کی کُھلی دلیل ہیں. امرار، علمار، اہلِ کمال اور صناعوں کے علاوہ یہ عرفار، صوفیا اور اولیار اللہ کا بھی مرکز رہا ہے. انھیں مقدّس بزرگوں میں ایک حضرت شاہ میران جی بہت بڑے کامل شیخ اور مشہور صاحبِ عرفان گزرے ہیں. علوم ظاہری کی تکمیل شہر کے علمار و فضلا سے کی. اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں مدت دراز تک رہے. کہتے ہیں کہ مدینہ منوّرہ میں بارہ ۱۲ سال تک قیام کیا اور ہر سال حج سے مشرف ہوئے. وہاں سے عازم دکن ہوئے اور شہر پناہ بیجاپور

کے باہر اقامت اختیار کی۔[1] آپ نے خواجہ کمال الدین بیابانی سے بیعت کی جو ایک واسطے سے حضرت بندہ نواز گیسو دراز خواجہ سید محمد حسینی قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔ حضرت میراں جی چشتیہ طریقے کے پیرو اور خلیفہ تھے، طلبہ اور فقرا کو ہدایت اور تلقین فرماتے تھے اور اکثر طلبہ آپ کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔

آپ کی تاریخ ولادت صحیح طور سے معلوم نہیں لیکن آپ کی وفات سنہ ۹۰۲ھ میں ہوئی۔ تذکرہ اولیائے دکن میں ان کی تاریخ وفات سنہ ۹۱۰ھ لکھی ہے، مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ "شمس العشاق" سے اُن کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے جو سنہ ۹۰۲ھ ہوتی ہے اور یہ مادہ تاریخ شاہ حسین ذوقی کا کہا ہوا ہے۔ صاحب روضۃ الاولیاء نے جو بیجاپور کے اولیاء اللہ کے حالات میں ہے، ان کے انتقال کی تاریخ نہیں دی۔ البتہ مجھے ایک پرانا مرثیہ ملا جو کسی نے حضرت میراں جی کی وفات پر لکھا ہے اُس سے اُن کی وفات کی تاریخ ۲۵ شوال ۹۰۲ ہجری معلوم ہوتی ہے جن اشعار میں تاریخ و سنہ کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:-

سرور میرا اُٹھ چل گیا ⁂ کرتار بھایا اُن کیا
جو اُن کیا میں سر لیا ⁂ جے کچھ حکم الٰہی کا
تاریخ حضرت سال نو نو ⁂ اپرا لگے بھی دو
دو دین مدت وفا شو ⁂ جے کچھ حکم الٰہی کا
اربع سون یو سال ہے ⁂ ماہ ہے کون شوال ہے
رحلت کئے اُس حال ہے ⁂ جے کچھ حکم الٰہی کا
تاریخ بست و پنج بود ⁂ بسیار گریان رنج شد
در حال واصل گنج خود ⁂ جے کچھ حکم الٰہی کا
شب پنج شنبہ روشن کیا ⁂ ہجرت منور پور کیا

---

[1] روضۃ الاولیاء (در حالات اولیائے بیجاپور) اور محبوب ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن۔ دونوں میں یہ لکھا ہے کہ علی عادل شاہ اوّل کے ابتدائی عہد میں وارد بیجاپور ہوئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ علی عادل شاہ اوّل کا عہد سنہ ۹۴۱ء سے سنہ ۹۸۸ھ تک رہا اور حضرت کی وفات ۹۰۲ میں واقع ہوئی، یہ سلطنت عادل شاہی کے بانی یوسف عادل شاہ کا زمانہ ہوتا ہے۔

جیوڑا قبض کر اُن لیا ٭ جے کچھ حکم الٰہی کا

ان کا مزار حصارِ بیجاپور کے باہر شاہ پور میں ایک بلند ٹیلے پر ہے جو بہت پُرفضا مقام ہے اور وہاں سے قدیم و جدید شہر بیجاپور کا منظر نہایت عمدہ نظر آتا ہے۔ قبر پر ایک گنبد ہے جس کا عکس اس مضمون کے شروع میں دیا گیا ہے۔ ہر سال ۲۵ رماہ شوال کو عرس ہوتا ہے اور زیارت کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔

علما کی نسبت صوفیا زمانے کی ضروریات اور حالات سے زیادہ واقف ہوتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ مقبول ہوئے اور انھیں اپنی دعوت میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ اپنے پیغام کی تلقین کے لئے ایسے ڈھنگ اختیار کرتے تھے جن سے بجائے وحشت کے لوگوں کو الفت ہوتی تھی اور ہر قوم و ملت کے لوگ حصول سعادت کے لئے شوق سے اُن کے پاس آتے اور اُن کی زیارت کو اپنے لئے موجب برکت خیال کرتے تھے۔ منجملہ اور طریقوں کے ایک یہ بھی تھا کہ باوجود صاحب علم و فضل ہونے کے وہ تلقین و تعلیم لوگوں کی عام زبان میں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اُردو ان بزرگوں کی بہت ممنون احسان ہے۔ حضرت میراںجی اگرچہ بہت بڑے عالم تھے مگر وہ اکثر طلبہ کے درس اور عام تلقین میں اُس زبان سے کام لیتے تھے جو اس وقت ہندی کہلاتی تھی اور جسے ہم ابتدائی اُردو کہتے ہیں۔ وہ اس زبان کے شاعر بھی تھے۔ چناں چہ اس زبان میں اُن کے نظم نثر کا کلام اب تک موجود ہے۔ اگرچہ بہت کم یاب ہے تاہم بعض چیزیں تلاش سے اب بھی مل جاتی ہیں۔ اُن کا جو کلام مجھے اب تک دستیاب ہوا ہے اُس کا ذکر مختصر طور پر یہاں کیا جاتا ہے۔

ایک رسالہ ان کا "خوش نامہ" کے نام سے ہے جو منظوم ہے اور سنہ کتابت ۱۰۶۸ ہجری ہے۔ یہ مثنوی کی طرز پر ہے۔ شروع یوں ہوتا ہے:-

صفت کروں میں اللہ کیری[1] جے پوری پورن پور
قادر قدرۃ انگیکاروں نیڑے[2] نا دُور
نا اُس رعب نا اُس دیکھ نا اُس ٹھان مکان
نرگُنا گُنونتا کر واکس مکھ کروں بکھان

---

[1] کی [2] نزدیک

لاشریک بے عدو واحد جہت جز ون بھی پاکھ
اُچھے سکت سیوک کیتے عالم چندین لاکھ

اس کے بعد ایک شعر نعت کا اور ایک منقبت کا ہے۔

ھندی شعرا بعض اوقات تصوّف اور معرفت کی باتیں عورت سے خطاب کر کے یا عورت کے حالات میں بیان کرتے ہیں۔ یہ دُنیا اُس کی سسرال ہے اور میکا عالم آخرت ہے۔ اسی طرح بطور استعارہ کے تمام مناسبات مثلاً زیور پہننا، مہندی لگانا، چرخا کاتنا وغیرہ عورتوں کے استعمال کرتے ہیں۔ اس نظم کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوش یا خوشنودی یا تو ایک فرضی لڑکی ہے یا حضرت کی کوئی عزیز یا بیٹی ہے۔ اس کے لئے یہ نظم لکھی ہے جس میں کچھ اوپر ایک سَو ستر شعر ہیں۔ چناں چہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

اس خوش نامہ دھریا نام دوہا ایک سو ستر
دسا زیادن پر ہے سونے تو ہے خوشی کا چھتر

اس کے بعد نسب نامہ بیان کرتے ہیں :۔

ذات میان کی چغتا جانو باب ترک افشاق
خوش کی ذات علوی جانوں جس تھی نام رزاق

پھر اس کے سبھاؤ کا ذکر کیا ہے :۔

بالی بھولی جیو جیوالی محبّت کیرا نور
پرم پیاری سات سنگھاتی تلنا ہوے دور
جب وہ آئی ات سنسار خوشی سو ہوئی تمام
پگون تب گرو کی لاگی لہیا خوشں کر نام
ہنسا وونی سوجھ نینی کو رورن کو کردی
بھوت ستیان پن یہ ست عجب کل جگ مانھین سردی
شہ بولی گنون کی سب پت لگاوے یہ من موہی
کون بکھانے لکھن اس کے نیا یا جانے سوہی

لاڑون لاڑ چاون چاوٗ سب گونوں کی پیاری
ست سنبھالے عین جھوالے محبت کی ہماری

وہ دوسری لڑکیوں اور عورتوں کی طرح بناؤ سنگار نہیں کرتی بلکہ اس کے دل میں خدا کی لگن لگی ہوئی ہے اور اُسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

کبھی نہ رنگی میدھی رنگون بھولوں باس نہ آیا
رنگ نہ رنگیا دنتون اس کے بھینی نہ ہلدون کایا
کہے منجھ سیر سہاگ اللہ کا چھڑ رہیا سہا وا
اب کیوں سر سہاوے دوجا تم کو ناہیں ٹھاوا
اس کے رنگون رنگی ساڑی دوجا رنگ نہ باتی
اس کے پاسا ہم کو باسا پھول پھوکٹ[1] کے آتی
ایسی بات کرے گنونتی مورکھ بوجھین سدہ
یہی من اپنے آوے چھند سوہی سکھا دین بودہ

جب لوگ اُسے اس بے پروائی اور بے نیازی کا طعنہ دیتے ہیں تو وہ جواب دیتی ہے کہ ہمیں یہی رنگ بھاتا ہے اور ہمیں دُنیا اور اس کے عیش و آرام سے کچھ کام نہیں :۔

کہیں بٹیا اے شوخ دین سن جی نیکی پنت
بھوک بلاس کر سوکھ[2] تنیں چھوڑین بعضے چھنت
کہے یہ سب حکم خدا کا جی تم آکھین یون
ہم کو بھاوے یک اللہ سو کرے وہ بھاوئے تیون
ناہم اچھین سوکھ سنسارا ناہم اچھین چاوٗ
ہم تو راون لوڑین اس سون جے ہے راون راوٗ
جے نرگن گنوں کا سبہن گنکون سو بوجھے اب
پن پاپ سٹ دیکھے[3] آپ شہ سون میلا ہوئے تب

---

[1] مفت [2] سکھ [3] پھینک دیجے

جیو پچھانے امر خدا کا وہی امر معروف
نہی کا ل نہین منکر ناہین تے پاپی مخدوف
راہ خدا کی بوجھ ندیکھیں دھاوین[1] چار و دہیر
ایک چھوڑ جی بھوتوں لاگین انکون ناہین پیر

پیر کی تعریف اچھے اور بُرے پیر کا امتیاز یوں بیان کیا ہے :-

پیر وہی جی پرم لگاوے نور نشانی عین
منترہ کی سدہ لکھاوے جہان دیس نارین
علوی نہیں جون چھڑی اکار اسوکھ سری جون بات
سفلی کھیل کھلاوے رایم اپنے فعلون سات
فعل سہاوا پنتھ اللہ کا جس راہ گئے رسول
کرمکھ پنتھ پچھانون سوہے جیہ جیون کا مول
جس مارگ[2] تھیں جیو سنجری سوہی مارگ سار
مارگ چھوڑ چلے کو مارگ تن کا ہین بچار
کرین جبھیں وہ تیرت[3] ہٹن لوگ ابھاسین دہیان
پانچو چیز ریا سون راکھیں کیوں کر دیجے مان
چندر سور کی ارتھ دکھاوین کرین اچنبھا جپ
ذاکر ہو من دم چلاوین یہ بھی دھیان الیپ
لونچت مونڈت پھرین بھوکٹ ترت[4] کرین یاج
تھان دیکھ جے دیوین مان وہ بھی مورکھ نلج

یا ان جانو پیر ملایا دیکھ ریا ہی مان
ٹوپی شجرا لیکر ناڈیا بھول شکر گون ہان

---

۱ دوڑین چاروں طرف ۲ راستے سے ۳ تیرتھ یا جاترا

ایسیان کیرا گرب نرا کھیں جے توں ہوسی سورا
مان راکھ مرشد ملاوے جس ہے گیان سپورا
تھان دیکھتیں لاگا بالک موکھ نہ آوے کھیر[1]
جس کے انگو بھرم نجاوے اس کیوں کہنا پیر

یا نکھارا[2] جانے ٹونا کوڑ کو جنتر بھاوَ
یا کرامت ابلیس کیری یا سینساری ماوَ
نفع ایسا لاگے تجھ اس کے سن کون ہان
بن اللہ اور نہ لوٹے وہی پیر پچھیان
بھوکا کھانے دوڑے دیکھ سہنک بھر یا کھان
ناروا سا دیکھے تو کھاتے کیوں ایمان

بے ایمانی کافر لوگ اس دنیاں کو بھول
بھوک لگے پر وہ بھی کھادیں وہ کیوں پڑیں قبول
راج دہن کو دیویں مان کر تیوں فقیر
جرم نہ چاکھے تاک جنہ وہ گیا بوجھیں کھیر
نفس ہوا کی مستی راکھیں ناریاں سیتی ہاوا
ناریاں دیکھ مدن کیا ان ماتیاں میں دوت چاوا[3]
دن رات اون اور نہ سوجھے بن پریں کے چالے
بی بیان کون بھی وہی کر جائے جیسے اپنے طالے

جن کوں شہوت کیرا ہاوا اُن کون دیسے پیر
جن کے پیر شیطین دے ٹونا آدین گے حق دہیر

---

[1] کھیر، اکشیر (شیر) دودھ [2] ایک آدھا [3] طالع

سوّر کے گل[1] باندھیاں مشک وہ کیا اس کون جانے
اس کے تائیں سر جیا وہ سوہی پچھان مانے
یا گدھڑے[2] پر قرآن لادیا یک نہ بوجھے بول
لایق اپنے کرے بیان لیہ موکر اپنا کھول

غرض اسی طرح پیر کے صفات کا ذکر برابر چلا گیا ہے۔ آخر وہ میراںجی سے عرض کرتی ہے کہ تم میرے حال پر توجہ کرو۔ مجھے دُنیا اور اس کی لذتوں سے کچھ غرض نہیں میں تو تمہارے پریم کی پیاسی ہوں اور تم ہی سے میری آس ہے۔ وہ خدا کی حمد کرتی ہے اور اس سے مناجات کرتی ہے:۔

منج نا لوڑے الوان نعمت محبوب پریمان پان
روکھی سوکی اوپر خوشی کاہ بڑائی مان
نامنج لوڑے پاٹ پتنبر یہ زر زری سنگھار
پھاٹی ٹوٹی کنبلی نیکی کلمہ جپن صار
نامنج لوڑے پلنگ نہالی صوفی ماڑی باغ
حسرت راکھ جیونا مرنا یہ توکسل داغ
جے نہ کایا دھول ملاویں کبھو نہ پرگٹ شوق
جے نہ عشقوں الجھو ڈھالے کبھو نہ پایا شوق

تیری بات اللہ سوں اچھی یعنے چھوڑیں کام
بھاوے سواس مانگ لیجے سُن کر حال تمام
حسرت میری کچھ نہ ابری دولت مرشد کیری
کہی کریمان کیا نلوڑ پروے آسا میری
توں قادر کر سب جگ سب کوں روزی دیوے
تو سبھوں کا داتا بیٹا سب جگ تجکوں سیوے

---

[1] گلے۔ [2] گدھا

سب کی چنتا تجکون لاکے جیسے جیوجیون
سب کا جان سجان تونہیں دے جے جس کے من
سبھون کون تون دیکھ سنبھالے تونہیں مارن ہار
یون کی کرتا کون کہے دے تین ادیکھ بچار
ایکس ماٹی مولی دیوے ایکس ماٹی باج
کیتون بھیکھ منگاوے کیتوں دیوے راج
کیتوں پات پتنبر دیتا کیتوں سر کی لایا
کیتوں دھوپ تلاوے کیتون اوپر چھایا
کیتے پلنگ نہالی اوپر کیتے پڑیں تلہار
کیتون کون دھڑ کو پٹ ناہین کیتون کو دھولار
کیتے گیان بھگت براگی کیتے مورکھ گنوار
ایک جن ایک مانس کیتا ایک پرس ایک نار
ایک فرشتہ یک شیطان یک چور ایک ساوٗ
ایک جھاڑ یک پتھر ماٹی ایک اگن ایک باوٗ
عرش و کرسی لوح قلم دوزخ بہشت نپایا
آسمان سور چندر تارے سب پر حکم چلایا
تجھتی ہی قدرت کون زور، تجھتی نور نورانا
تجھتی سب کا سبھین پنا تجبن سبھین بیگانا
تجبن کوی نہ مار جوادے، تجبن کوئی نہ آس پوراوے
عالم اوپر بایا بھنا کرے حکم سون جیسا بھاوے
بہشت میانے آگ اجادے، دوزخ کون سکے بھاوے
پکڑ بھکاری تخت بٹھاوے راجے راکھی گرد ملاوے
فہمندیان کون کرے دیوانے سو کہیان لیں دکھ مین بھانے

کر کر بندگی جرم گنوادے پھر پڑے تیج عجب کیا رلنے
میں اس کارن بھوت ڈروں ڈر کر جاوں کہاں
جہاں جہاں میں چھپن لوڑوں تو ہی تہاں تہاں
اب نہ چھپوں اب نا ڈروں، ڈروں تو کہانلک ڈروں
ہمیں غریب نپارے تری آس تھی آسا دھروں
ماتا جے بالک تھی روسی جانا اُنھیں کدھر
آپ جس مارگ لاسی (میراں) میں جاوں تدھر
تو رحمان رحیمان میرا مہر محبت بھریا
میں تو باندی بردا تیری تیں منجھ ہاتوں دھریا
نا میں کیتی بندگی تیری نا دھر کیتی یاد
داگم کیتی اگل تیرے سلکوں تھی فریاد
تیں بھی میرے لاڑ چلایا کبھوں نہ ہوا اُداس
اب سندیسا توڑ گُسائیں تیری منج کون آس

یہ دعا قبول ہوتی ہے اور ہاتف خوش خبری دیتا ہے۔ فرشتے ادب سے حاضر ہوتے ہیں اور آسمان سے نور کے طبق آتے ہیں اور پھولوں کی خوشبو سے زمین آسمان مہک اُٹھتے ہیں۔ خوشنودی کا یہ آخر وقت ہے اور وہ اس دُنیا سے چل بستی ہے۔ میراں جی اس کے اخلاق اور نیکی کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی عمر اور مقام وفات کا ذکر کرتے ہیں :-

رجس کی تھی اس پڑی قبول تھان خوشنود
خوشنودی جب اللہ کی سبھیں نرمل دود
برس پانچ اور بارا کی یک ماس نو دیں
اس کی عمر لیکھتیں سب لیکھا ہوا اس کی کھیں
تھان کیا (شاہ پور) ماہنیں وہ تو پیارا تھام
پیروں کیرا قول ہوا کہ تجھسوں ہمیں تمام

یعنے ۹ برس ایک مہینے اور نو دن کی عمر تھی اور شاہ پور میں انتقال کیا شاہ پور وہی مقام ہے
جہاں حضرت میران جی نے بیجاپور میں آکر سکونت اختیار کی تھی۔

نظم کے آخری اشعار یہ ہیں :-

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوش خوشیاں، اللہ اکبرا نورا اعلیٰ نور
کھنڈیا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام
خوش سب کوئی دایم قائم جتیا خواص عوام

علاوہ اس کے اس نظم میں تین جگہ حضرت میرانجی کا نام آیا ہے جس سے اس بات کی اور
زیادہ تصدیق ہوتی ہے کہ یہ نظم انھیں کی ہے۔ وہ شعر یہ ہیں :-

سنون (میرانجی) اگن دھن میں جل بل تمل پتون
میری آہ نہ آوے کسی جاے کیدھر میں چھپون

کیا میں چوکی، کی یوں کیتی تم تو جیو جیون
کا ہے کیتی سخت (میرانجی) منجہ غریب تھی من

ماتا جی بالک تھی روسی جانا انھیں کدھر
آپ جس مارگ لاسی (میران) میں جاون تدھر

اگرچہ یہ تینوں شعر خوشنودی کی طرف سے میران جی کو خطاب کر کے لکھے گئے ہیں، لیکن
صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے میرانجی ہیں۔ اس نظم کے میرے پاس ۲ دو نسخے ہیں۔
دونوں میں یہ کلام حضرت میران جی ہی کا بتایا گیا ہے۔ کتابت بھی ان کی قدیم ہے یعنی ۱۰۶۸ھ

خوش نغز

یہ نظم بھی خوش نامے ہی جیسی ہے۔ خوش یا خوشی سوال کرتی ہے اور میرانجی جواب دیتے

ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام بھی خوش نغز ہے۔ نظم میں جگہ جگہ اسی ڈھنگ سے میراںجی کا نام آیا ہے جس طرح ہم نے خوش نامے میں دیکھا ہے۔ اگرچہ اس میں گنتی کے کل بہتر۷۲ شعر ہیں، لیکن اسے ۹ نو باب میں تقسیم کیا ہے۔ یعنے باب اوّل عرفان و روح۔ باب دوم عرفان عالمہا۔ باب سیوم عرفان مراقبہا باب چہارم عرفان ذوق نور۔ باب پنجم عمل مماحی بر لا یقان۔ باب ششم موت عارفان۔ باب ہفتم۔ بحث عقل وعشق۔ باب ہشتم بیان کرامات۔ باب نہم بیان موحد ملحد

ہر باب کے شروع میں خوش کی جانب سے سوال ہے اور میراںجی کی طرف سے جواب ہے۔ سوال وجواب کی نوعیت اُن عنوانوں سے ظاہر ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں۔

نظم کی ابتدا میں ایک شعر ہے جو بطور تمہید لکھا گیا ہے وہ یہ ہے:-

جے ہماری ارادت کی اُن کا یہ احکام
نماز، تسبیح، نیتان، ذکر اللہ یک نام
اس پر جیتا رہے صدق سن آوتا اچھے للب
دین، دُنیا، دیدار، بہشتان پاوین بے حساب

اس کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے۔ مثلاً باب دوم یوں شروع ہوتا ہے:-

خوش پوچھے کے کہو میراںجی عالم اچھے کیتے
پیر کہین سن جیتے تن اچھین عالم تیتے

باب ہفتم جو عقل وعشق کی بحث میں ہے یوں شروع ہوتا ہے:-

خوش کہے مج کہو میراںجی عشق بڑا یا بودھ
پیر کہین میں آکھو بیان اس میں دھرنا سودھ

باب ہشتم:-

خوش پوچھے کے کہو میراںجی حال کرامت کیرا
حلال حرام کھول کھوجی بوجھے یہ من میرا

باب نہم:-

خوش پوچھے موحد کے لکھن کہو پیارے پیر
کھولو ملحد کیریان بیان یک یک مج دھیر

غرض اسی طرح آخر تک سوال و جواب ہیں۔ پہلا شعر سوال کا ہے اور باب کے باقی شعر جواب کے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔

شہادت الحقیقت

یہ رسالہ بھی نظم ہی میں ہے اور خوش نامے سے زیادہ بڑا ہے۔ اس میں پانسو ترسٹھ شعر ہیں۔ اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں۔ ایک میں تو صاف حضرت میرآنجی کی تصنیف بتائی ہے، دوسرے میں کسی کا نام نہیں لکھا۔ لیکن خود نظم میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ یہ انھیں کی تصنیف ہے۔ حمد و نعت اور منقبت کے بعد خاندان چشتیہ اور اپنے پیر حضرت شاہ کمال بیابانی کا ذکر کیا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:۔

اس کمالیت کے سنگ ؛ اس خانوادہ کے انگ
اُن کمائے اپنا حال ؛ تو ہوے پیر کمال
کچھ تھے نصیب میرے ؛ پگ، دیکھے تو اُن کیرے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نظم حضرت میرآن جی ہی کی ہے۔ یہ بھی تصوف اور معرفت میں ہے۔ بحر صاف اور ہندی ہے، زبان بھی کسی قدر صاف ہے۔ حمد سے شروع کی ہے جس کے شعر یہ ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن ؛ الرحیم توں سبحان
توں دانا اور بینا ؛ توں سب تھی ہے توانا
یہ سب عالم تیرا ؛ رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نکوی ؛ نہ خالق دوجا ہوی
جے تیرا ہوے کرم ؛ تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھکو داؤن ؛ اور تیرا نام لیون
تجھ نرتا کون جانے ؛ اور پوری صفت بکھانے
ہے تیرا انت نہ پار ؛ کس موکھوں کروں اچار

سب حال تجھ بہنا ÷ راکھے تیوں رہنا
جو تیرا امر جانے ÷ اس ہی کوں نہ ٹانے

اس کے بعد نعت ہے جس کے چند شعر یہ ہیں :۔

محمد نبی تیرا ÷ اس پر ایمان میرا
نادر ہس ویں اس باج ÷ سب عالم کیرا تاج
جو اس کی رخ آوے ÷ سو تیرا درس پاوے
اس بھول جے کوئی تھاکے ÷ تے دوزخ مان راکھے
یہ نبی تجھ پیارا ÷ سب امت سیتیں سارا
وہ نبی اوّل نور ÷ پس عالم یہ معمور
نورانی احمد نام ÷ یہ اچھا ذوق آرام
یہ میم احمد میں آیا ÷ تو احمد نام کوایا[1]

اس کے بعد منقبت اور منقبت کے بعد اپنے پیر کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تصوّف کی وہی معمولی باتیں ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے تصوّف و معرفت کے مسائل بیان کریں ہندی میں لکھنے کی وجہ اور معذرت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بہت ایسے لوگ ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی، ان کے لئے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر پر نہ جانا چاہیئے، باطن کو دیکھنا چاہیئے۔ زبان کوئی بھی ہو، معنوں پر خیال کرنا چاہیئے۔ جیسے مٹی چھان کر سونا نکالتے ہیں اسی طرح بات کے مغز کو لو اور لفظوں پر خیال نہ کرو۔

ہیں عربی بول کیرے ÷ اور فارسی بھوتیرے
یہ ہندی بولوں سب ÷ اس ارتوں کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی ÷ پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گر مکہ پسند پایا ÷ تو ایسے بول چلایا
جے کوئی اچھیں خاصے ÷ اس بیان کیرے پیاسے

---

[1] کہلوایا

وے عربی بول نہ جانے ⁂ نا فارسی پچھانے
یہ ان کون پکن ہیت ⁂ سنت بوجھیں ریت
یو دیکھت ہندی بول ⁂ پن معنی ہیں نِتول
کڑوے پن سو رس ⁂ پھل پاکے جوں پھنس
نا دیکھت بورا لیکھو ⁂ لے مغز چاک دیکھو
جے مغز میٹھا لاگے ⁂ تو کیوں من اس تھی بھاگے
تیوں اس میں ارت پنیچ ⁂ سب قرآن کیرے نیچ
وہ مغز معنی لیو ⁂ سب چھال چھاڑ دیو
یا وہ دیکھے چھارا ⁂ اس ماٹی کا پسارا
نا ماٹی اس کو ہان ⁂ وہ راکھے سمیٹ آن
یہ چھان سنا لیوے ⁂ اور بعضے ناکہ دلوے
تیوں بھاکا ماٹی جانوں ⁂ زر معنی دل میں آنوں
تو جس کون بھاوے جوڑ ⁂ نا جاسی یہ گن چھوڑ
ہے کڑورن کیرا ہیرا ⁂ گھوڑے اوپر پڑیا نیرا
کوئی سجان بھاگوں پاوے ⁂ تو کیوں نا لیھا چاوے
گھر بھاگا چھوڑ دیجے ⁂ چن معنی مانک لیجے

اس کے بعد کتاب کا نام اور اس کی خوبیاں بتائی ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:۔

اس نام ہے تحقیق ⁂ سن شہادۃ التحقیق
اس کا مغز دیا ⁂ جی دیکھ نت رہے بھریا
سب ہیروں کیری کھان ⁂ نا موتیوں کیری وان
جے غواص بوڑ لیوے ⁂ تو سالم سودھا لیوے
جے ہو ویگا پھارا ⁂ کیا جانے گا بچارا

۱؎ بڑھل ۲؎ بڑا ۳؎ چکھ ۴؎ سے ۵؎ (ن) جھالے ۶؎ سونا ۷؎ کوڑی
۸؎ اٹھاوے ۹؎ (ن) جو دیکھیا سو رس بھریا۔

اس کے بعد تصوّف واخلاق کے مسائل بیان کئے ہیں، اور یہ سب سوال وجواب کے طرز میں ہے۔ سوال طالب کی طرف سے اور جواب مرشد کی جانب سے ہے۔

آخری شعر یہ ہیں:۔

ہے کہیا نہ آوی ٭ نا نہیں کھیا کر جاوی
سن یہ گت کیوں کر سوجھے ٭ جس قربت سوہی بوجھے
اپناں جیسا دیا ٭ تو بوجھیں اچھے جیسا
اب تو سب سوکہ چام ٭ سن تمت ہوا تمام
ہم گھٹ رہیا پور ٭ تو شاہی سیر ظہور

شرح مرغوب القلوب

یہ چھوٹا سا رسالہ نثر میں ہے۔ اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں اور دونوں میں یہ حضرت میراں جی ہی کی تصنیف بنایا گیا ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور متفرق حدیث وآیات کے ترجمے اور مختصری تفسیر کے بعد اسے دس باب میں تقسیم کیا ہے۔ جن کے عنوان یہ ہیں۔

پہلے باب میں توبہ۔ دوسرا باب، طریقت کا پچھانت کرنا نفس، دل، روح، سر، ذات، شریعت، حقیقت، معرفت اوپر۔ تیسرا باب وضو کا۔ چوتھا باب، دنیا ترک دینا۔ پانچواں باب، تجرید ہور تفرید۔ چھٹا باب، اپنی پچھانت سوں نور محمدؐ کا اس پچھانت میں جیسا سا تواں باب، عشق کا۔ آٹھواں باب، معشوق۔ نواں باب، فنا ہور بقا ہونے کا۔ دسواں باب، سفر کا۔

ان بابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ پہلے وہ قرآن کی آیتیں مگر زیادہ تر حدیث نبوی لکھتے ہیں اور اس کے بعد ترجمہ اور مختصر تشریح کرتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ کتاب بہت معمولی ہے اور کچھ اہمیت نہیں رکھتی، البتہ زبان کی تاریخ کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

اس نثر کے چند نمونے نیچے لکھے جاتے ہیں، جن سے اُس وقت کی زبان کا اندازہ ہوگا۔

بسم اللہ کے بعد ابتدا یوں کی ہے:۔

"كل امر ذى بال لم يبدأ به بسم الله فهو ابتر۔"

پیغمبر کہے جے کچھ کام کرے گا کوئی خدا نانوں نالے کو تو او کام پایمال ہوے گا۔

"الحمد لله رب العالمين۔"

سرانا نواز نا خدا کون بہوت کہ او پالنہارا ہے عالم کا۔

"والعاقبة للمتقين۔"

ہور اُس عالم میں خوبیاں دیوے گا، کہیا ہے، آپس کو پچھانے سولوکاں کون ہور پرہیز گاراں کون۔

("آپس کو پچھانے سو لوکاں" صاف سیدھا ترجمہ ہے عارفین کا)

"والصلوٰة على رسوله محمد وآله اجمعين۔"

ہور درود اپنے رسول پر بھیجنا اور اُن کے فرزندان پر ہور سب اُمّت کے خاصان پر۔ سوا اے معنے ہے کہ آپس کون دیکھ کر بندگی کرو، کھتیا پیغمبر کوں ہور پیغمبر کے فرزندان کون ہور سب اُمّت کو کہیا۔ ہور محمدؐ پر درود بھیجنا، سویہ معنے ہور اُن کے فرزنداں پر (اے تشریف بھیجنا۔ نسخہ ثانی)۔ ہور خدا کا صفت بھوت کرنا، بھوت سرانا، بہت نواز نا جس نے پیدا کیا سب عالم کون ہور ہمنا کون عقل ہور دین دیا ہے۔

"كل امر ذى بال لم يبدأ بالحمد فهو اقطع۔"

پیغمبر علیہ السلام کہے جو کچھ کام کرے گا کوئی خدا کا صفت کئے باج سو اس کا کام نا ہوی۔ ہور خدا کی صفت، محمدؐ کی صفت کرنا ہور درود بھیجنا دل کے جیو کی خوشنودی سون

چند اور مثالیں:

"پیغمبر علیہ السلام کہے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجتا ہے، انو کیاں توں رہ کر انوتھی تو بوجھ، انوتھی توں سن ہور چپ نکو اچھ۔ اس چار باتاں کا پند ہے یوں (توں) شریعت میں پہلے پھلیں پاوں رکھ کہ طریقت شریعت منج ہے (یعنے جو لوگ خدا کی معرفت رکھتے ہیں، اُن کے پاس رہ کر تو معرفت حاصل کر اور اُن کی باتیں سُن اور چُپ نہ رہو۔ یہ چار باتوں کی نصیحت ہے کہ پہلے تو شریعت میں قدم رکھ کیوں کہ طریقت شریعت میں ہوں)

"اے ایمانی (یعنے مومن) یاد کر خدا کوں، بہوت یاد کر ہور رو رو کر یاد کر ہور یگانہ ہوا سالک اپٹر (اپٹرنا: پہنچنا، حاصل کرنا) توں باج توبہ بندگی کرنا یوں ہے جوں جھالاں کا پانی جھوٹ ہے، اے (یہ) بندگی بی (بھی) جھوٹ ہے خدا کا پچھانت باج (جھال پانی کی خفیف سی بوچھاڑ جو تھوڑی دیر کے لیئے موسم بے موسم ہو جاتی ہے۔ دوسرے معنے جھالان کے پانی کے سراب کے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ قدیم دکھنی میں جھال نظر کے فریب کو بھی کہتے تھے۔)

"اپنی پچھانت سوں نور محمدؐ کا اس پچھانت میں بیسنا جیوں غواص دریا میں بیس کر موتی لیاتا ہے، یوں اس پچھانت میں بیس کر اس میں کے موتی لیاوے۔ (بیسنا: بیٹھنا یا پیٹھنا، گھسنا)

"خدا کہیا، تحقیق مال ہور ننگڑے تمہارے دشمن ہیں، چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ ملے کیسا غفلت ہے جو تجھے اندھلا کیا موت کی یاد بھی تجھ بسرا کر۔"

(ننگڑا، قدیم دکھنی میں بچے کو کہتے ہیں۔ ننگڑے سے مراد یہاں بچّے یا اولاد ہے۔ اندھلا کے معنے اندھے کے ہیں)

ان مثالوں سے اُس زمانے کی زبان کا اندازہ ایک حد تک ہو سکتا ہے۔ یہ صوفیا وہی زبان استعمال کرتے تھے جو اُس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی۔ اور جو عربی فارسی الفاظ بگڑ بگڑا کر عوام کی زبان پر چڑھ گئے تھے، اُن کی کبھی صحت نہیں کرتے تھے بلکہ جیوں کے توں رہنے دیتے تھے۔ کیوں کہ اب یہ لفظ عربی فارسی کے نہیں رہے تھے بلکہ اس نئی زبان کے ہو گئے تھے جو بول چال میں نیز تحریر میں آگئی تھی۔ مثلاً

"دنیاں کو چھوڑ دیں گے بدل خدا تھی خدا کی مدت سوں" یہاں مدد نہیں لکھا بلکہ مدت ہی لکھا کیوں کہ بول چال میں مدت ہی آتا تھا۔ ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں۔

اسی طرح لفظ جس طرح بولا جاتا تھا ویسے ہی لکھتے بھی تھے۔ مثلاً وضع کو وضا لکھتے تھے اور وفا، جفا کا قافیہ باندھتے تھے۔

قافیے میں آواز کا لحاظ کرتے تھے، تحریر پر نہیں جاتے تھے۔ چناں چہ خوش نامے اور

خوش نغز میں میرآں جی نے باس اور پاس کا قافیہ خاص باندھا ہے۔ قدیم دکھنی میں اس کی مثالیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔

عام خصوصیات زبان کی وہی ہیں جو قدیم دکھنی میں پائی جاتی ہیں اور جس کے متعلق ہم اس رسالے میں کئی بار لکھ چکے ہیں۔

میراںجی کی زبان چوں کہ بہت پرانی ہے اس لیے اس کا سمجھنا اور اس سے لطف حاصل کرنا مشکل ہے، تاہم بعض بعض شعر اور مصرعے ایسے بے ساختہ نکل گئے ہیں کہ لطف سے خالی نہیں، مثلاً

من بھاوے تو دے کھیجے ؛ بن بوجھیں دوس نا دیجے

مطلب صاف ہے کہ یوں جی چاہے تو برا بھلا کہئے لیکن بغیر تحقیق کئے کسی کو الزام نہیں دینا چاہیے یہ شعر ضرب المثل ہونیکے قابل ہے۔ اس میں کہاوت کی ساری شان موجود ہے۔

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء)

حضرت شاہ برہان الدّین جانم

حضرت شاہ میرانجی شمس العشاق کا حال، گزشتہ باب میں تحریر ہو چکا ہے۔ شاہ برہان الدّین جانم قدس سرہ اُن کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی کا اکتساب اپنے والد سے کیا۔ اپنے وقت کے بڑے عارف اور صوفی تھے۔ لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔ تصوّف اور سلوک میں متعدد رسالے تحریر فرمائے۔ اکثر ہندی زبان میں، جسے ہم ابتدائی اُردو کہتے ہیں، تلقین فرماتے تھے جو اُن کے رسائل سے ظاہر ہے۔

موئف روضۃ الاولیائے بیجاپور نے ان کی تاریخ وفات صرف پانزدہم جمادی الاخری لکھی ہے، سنہ نہیں لکھا ہے۔ تذکرۂ اولیائے دکن کے مؤلف نے آپ کے وصال کا سنہ ۹۵۰ ھجری لکھا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ ان کا ایک رسالہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) سنہ ۹۹۰ ھجری کی تصنیف ہے۔ اور چوں کہ یہ سنہ انھوں نے خود اپنی نظم میں لکھ دیا ہے، اس لئے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہمارے خیال میں یہ اُن کی آخری تصنیف تھی اور اسی سال میں انتقال فرمایا۔ علاوہ اس کے اُن کی ایک نظم نکتۂ واحد کے نیچے اُن کی زبانی دو "فرمان" لکھے ہیں جس میں سے ایک کی تاریخ ۶ ماہ صفر سنہ ۹۶۷ ھجری

اور دوسرے کی ماہ صفر ۹۷۷ھ ہجری درج ہے۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ ان سنین میں زندہ تھے۔ والد ماجد ہی کے مقبرے میں مدفون ہوئے جس کی تصویر پچھلے رسالے میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کا عرس ۱۶ جمادی الاخریٰ کو ہوتا ہے۔

میرے پاس ان کے کلام کا بہت بڑا مجموعہ ہے۔ ان میں سوائے ایک کے باقی دس سب منظوم رسالے ہیں جو تصوف سلوک کے مضامین پر لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے دوہرے خیال اور مختلف چھوٹی نظمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) وصیت الہادی — اس میں ذکر جلی، ذکر قلبی، ذکر سری اور اسی قسم کی سلوک کی باتوں اور روح کا ذکر ہے۔ شروع میں دو شعر حمد میں ہیں:۔

سکتا قادر قدرۃ سوں سمجھے تجھ کوں کوئی کیا
جس کوں لوڑے[1] دیوے راہ کہیا یہدی من یشا
بہ روپ پرگٹ آپ چھپایا کوئی نیایا انت
مایا موہ میں سب جگ باندھیا کون کر سوجھے پنت

اس کے بعد دو شعر نعت کے ہیں:۔

کیا محمدؐ جگ میں پیارا جستیں[2] سمجھی راہ
شیطان مدعی پکڑیا باٹ کیوں کر سکیں جاہ
محمدؐ جس کی پیت بتھنکا اس کوں کیا ہے ڈر
نت اوٹھ سمریں دل میں اس کوں کلمہ جپنے کر

اس کے بعد شریعت پر قائم رہنے کی ہدایت کی۔ دوئی کا اور شیطانی مقامات کا پتہ بتایا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رستہ سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں:۔

امر خدا کا لیاوے بجا توں نہی تھی منکر ہونا
مقام شیطانی جس کوں کہنا دل تھی سارا دھونا
چلنے کا تو نیم نہوے یہ توشا ہوکٹ کھایا
اس دھات عمر خرچ کیتا آخر پھر پچتایا

---

[1] چاہے [2] جس سے

تو نفس سوں زہد تقوی راکھین شرع محمدؐ آوے
ہونت مشغول ذکر جلی سوں منزل ناسوت پاوے

یہ کہہ کر وہ اپنا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ آخری شعر یہ ہے:۔

ظاہر باطن کا وہ دانا سکتا ہے سبحان
سب پر شاہد مطلق بینا تجھ پر لیہ برہان

(۲) ایک نظم "سُکھ سُہیلا" کے نام سے ہے۔ جس کے معنے ہیں سُکھ کا گیت۔ سُہیلا اصل میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جو تعریف میں ہو۔ یہاں اسے روحانی معنوں میں لیا ہے۔ اس نظم کا ہر چوتھا مصرعہ یہ ہے:۔

لوکان یہ مت کہے الادھی جس بوجہہ بختوں لادھی

مثلاً:۔

گُن آدم کا نہ ہات چڑھے رے کیون کہنا انسان
صورت پر اعتبار نراکھیں جیسے ہین حیوان
بلکہ ان تھی گمراہ کریون قرآن میں فرمان
لوکان یہ مت کہے الادھی جس بوجہہ بختون لادھی

اوپر کی مثال میں آپ نے دیکھا کہ کس طرح ہندی اور عربی کے لفظ آپس میں گھلے ملے ہیں۔ اسی لئے ہم اسے ابتدائی اُردو کہتے ہیں۔ اسی نظم کی ایک دوسری مثال لیجئے جو پوری ہندی ہے اور عربی فارسی لفظ کا نام نہیں:۔

پنتھ اکاس کا ویکھ جانے جل کا مارگ مینؒ
سادھو کا انت سادھو جانے دوجے کون نہیں چین
ایسا سادھو بھاگو نہیں تو چر نور ہنا لین
لوکاں یہ مت ....

یہ حقیقت میں وہ زمانہ ہے جب اُردو بن رہی تھی۔ اس نظم میں کل ۵۶ شعر ہیں اور معرفت کی عام باتیں ہیں جو شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کی ہدایت کے لئے فرمائی ہیں:۔

۱؎ رستہ ۲؎ مچھلی

(۳) منفعت الایمان

شروع دو چار شعر حمد میں ہیں :-

اللہ واحد سرجنہار
دو جگ رچنا رچیا اپار
سگلا[1] عالم کیا ظہور
اپنے باطن کیرے ظہور
دیکھن جو مذہبی لایا جگ
نہ بجھے اس کون لگ
غفلت کیتا پردا آڑ
سب جگ لیتا اس میں آڑ
بھوتوں خلق کیا بچار
بھولا سب جگ غفلت مار

نعت :-

نبی کیری بھوے راہ ؛ اُن میں تھوڑے حق آگاہ
جس کون ہووے ارادۂ حق ؛ تو وہ بوجھے حق مطلق

اس کے بعد ملحدون کے مختلف عقائد بیان کئے ہیں اور یہ سب بیان کرنے کے بعد اُن کی تردید کی ہے اور مریدوں کو اس سے نچنے کی ہدایت فرمائی اور خدا کی توحید اور اس کی عظمت کا بیان کیا ہے. یہ نظم بہت صاف اور اچھی ہے. مثال کے طور پر دو چار شعر ملحدون کے عقائد کے متعلق اور دو چار نصیحت کے بیان سے نقل کیئے جاتے ہیں :-

کوی کہیں سب عشق تمام ؛ عشق کی انگھین[2] کیا ہے فہام[4]
عشق لیا ہے سب بھر یاس ؛ عشق تھی سگلا بھوک بلاس

---

[1] سب [2] پناہ [3] آگے [4] فہم

بعض آکھیں اپنی بوجھ ؛ معلوم نہیں کچھ اس کی سوجھہ
ایک جمع سب پکڑیا بار ؛ جوں کنے بیچ میں تھی نکلیا جھاڑ[1]
کانٹا چھانٹا پھل اور پھول ؛ شاخ برگ سب دیکھ اصول
ایک جمع کر راکھین بار ؛ بیچ پنے کا ناہیں بچار
ایکی بجین بیج اپار ؛ بیج پنے سو سگلا جھاڑ
کوی کہیں یہ دیکھ مقیم ؛ یو سب عالم ہے قدیم
نہ اس خالق مخلوق کوے ؛ جیسا تیسا سمجھیا ہوے

نصیحت کے بیان سے چند شعر لکھے جاتے ہیں :۔

ایسا مالک ایکہ ہوئے ؛ ملکت ناہیں دوجا کوے
جے اس شرکت ہوتا آد ؛ ہوتا کل جگ مانہ فساد
جے ایک شاہ پر دوجا اور ؛ تو اس غوغا اگلا شور
کو رٹے[2] ملک تھی امن امان ؛ حاکم حکم یوں کرتا جان
وہ سب شاہد عالم کا ؛ مالک وہ جگ سالم کا
نروپ نردہار روپ لیسے ؛ سب جگ ادھار وہی دیسے
قدرت یوں کر سب جگ زیر ؛ جون اس بھاوے دیوے پھیر
ایسا بیچگو نہ جان ؛ اس پر دیا دین کون ایمان

آخری شعر یہ ہے :۔

بندے سگلے ناتوان ؛ اللہ راکھے آپ پنہان[3]
یوں فرمائے شاہ برہان ؛ اس میں آہے نفع ایمان

اس نظم میں کوئی ایک سو بیس شعر ہیں :۔

(۴) نکتۂ واحد

یہ نظم بارہ شعر کی ہے جس میں توحید کی تلقین ہے اور ہر حرف ابجد سے کوئی لفظ بنا کر

---

[1] درخت [2] مفقود ہونا [3] پناہ

ہدایت فرمائی ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:-

نکتہ واحد اپنیں احد ہے الف ذات اللہ صمد ہے
ب بہ روپ کر آپنیں ایک ت تمام سے پرگٹ لیکھ

اسی طرح "ی" تک لکھتے چلے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ دوسری نظم بھی اسی قبیل کی ہے۔ اس میں بھی ہر شعر کی ابتدا میں حرف ابجد ہے اور اس سے لفظ لے کر شعر کہا ہے۔ مثلاً

الف ایمان اللہ پر لیاؤ ان سب جگ نپایا
ایسی قدرت بہ بہانت رچیا آپس آپ چھپایا
ززینت دنیان کا چھوڑیں زحمت جاوے نہاس
زیادتی تو بہت نہ آوے زبان ان پڑے پاس

اس میں کل اُنتیس شعر ہیں۔ عربی حروف ابجد اٹھائیس ہیں۔ لیکن آخر میں ایک شعر "پ" کا اور بڑھا دیا ہے۔ وہ یہ ہے:-

پ پورا جے طالب ہوے پر نور اس کا دل
پاک پند شا بر راہ آکھے پیارے حق کے واصل

(۵) نسیم الکلام

پہلے قرآن کی ایک آیت لکھی ہے، پھر اس کا مطلب اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔ آیت کے ساتھ کہیں حدیث بھی لکھ دی ہے۔ دو چار شعر اس طرح لکھ کر پھر وہی مطالب بیان کئے ہیں جو بعض اوپر کی نظموں میں ہیں۔ اس میں کل ۵۴ شعر ہیں۔

(۶) رموز الواصلین

یہ نظم بھی اسی قسم کی نظموں میں سے ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس میں نور، روح، دل و نفس کی شناخت کا ذکر ہے اور اُن کے مقام فنا و خدا سے بحث کی ہے۔ مراقبۂ نفس،

لہ بہت ٹہ بھاگ

مراقبۂ دل، مراقبۂ روح اور مراقبۂ نور کے اصول بتائے ہیں اور اس کے بعد محققانہ گفتگو فرمائی ہے اور وصل و فراق، اعلیٰ عاشق اور ادنیٰ عاشق، تجرید و تفرید کا بیان فرمایا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن کوئی خاص ایسی بات نہیں جس کا ذکر یہاں کیا جائے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے :-

اللہ پاک منزہ ذات ٭ اس سوں صفتاں قائم سات
علم، ارادت، قدرت بار ٭ سنتا، دیکھتا، بولنہار
حی صفت یہ جان حیات ٭ اس کوں ناہیں کدھ مات
ایسیاں صفتاں سوں ہے ذات ٭ جوں کہ چند نا چاند نگات
احدیت وہ ذات اپین ٭ بعد از صفتاں اُس پچھین

نظم کے آخر میں نظم کا نام بھی بتا دیا ہے :-

یو سب بولیا مختصر ٭ جن وہ لوڑے دے نظر
ناؤں ہے رموز الواصلین ٭ سالک پر دیکھ آئے یقین

تمت اس نتھی کیا تمام ٭ حق تھی بولیا حق کلام
رموز الواصلین کہی بیان ٭ بندگی حضرت شاہ برہان

(۷) **بشارت الذکر** :- اس نظم میں ذکر جلی و خفی، قلبی و روحی کا ذکر ہے۔ ساڑھے شعر ہیں جس کا اظہار انھوں نے خود کر دیا ہے۔ آغاز یوں ہے۔

اللہ اسم ذاتی دہوں جگ ازل
جلی ہم خفی در کیا ہے فضل
شرف نام دیتا سمہرا اُپر
ملائیک جن جگت ہر اُپر
دھوں جگ سمرین اللہ ٹیک نام
کہ مخلص و عابد جپے ہیں مدام

خلیل محب صادق ولی اتقیا ٭ اسی نام سیتی محیط دل کیا

آخری شعر یہ ہیں :۔

یہی حال واصل تو بجھین صفا ٭ کہ رمزی خفی ہے صفا در صفا

نظم دیکھ کیتا گنت ساٹ یہ ٭ یک یک آن موزوں کیا پاٹ یہ

خلاصہ مذکور ہوں تمام ٭ بفضل النبی علیہ السلام

(۸) حجت البقا

اس نظم میں خدا کی توحید اور اس کی ذات اور صفات کی تلقین ہے۔ شروع یوں ہوتی ہے :۔

آپ واحد وہی یکٹ ٭ دیکھ قدرت کیا بکٹ

جے دہاوے اس کے پنتھ ٭ نہ سمجھا کس یہ انت

ان اپین اپرم پار ٭ نہ کھوجت پاوین ٹھار

بیچوں چگو نہ جان ٭ کیون کرتا اس بکھان

جے نظروں دیکھ نہ آوے ٭ نہ بوجھیں بوجھیا جاوے

یہ معما بہت نکیر ٭ جے دھاوے اس کی دھیر

آگے چل کر یہ نظم سوال وجواب کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ سوال طالب کی طرف سے ہے اور جواب مرشد کی جانب سے۔ اس کی صورت انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ایک طالب تھا جسے علم کا غرور تھا اور سر میں خودی سمائی تھی، مگر چوں کہ کسی سے ارادت اور محبت نہ تھی اس لئے بے بہرہ تھا مرشد کی ہدایت نہ ہونے سے اُس کا سارا علم اور اُس کی ساری ریاضت بے کار تھی۔ اس نے سُنا کہ کسی جگہ ایک مرشد کامل اور صاحب عرفان ہیں۔ اسے ملنے کا شوق پیدا ہوا اور دل میں یہ خیال آیا کہ اُسے چل کے آزماؤں۔ چناں چہ وہاں پہنچا اور اس نے سوال کرنے شروع کئے اور مرشد نے اُس کے جواب دیئے۔ آخر میں وہ قائل ہو گیا اور سارے شکوک رفع ہو گئے اور مرشد کے پاؤں پر گر پڑا۔

سلہ دوڑے

طالب کا حال وہ یوں بیان کرتے ہیں :-

آپ خودی کی مت لیتا ؛ کہیں یک چت سیوا نہ کیتا
ناست کا گرو میلایا ؛ جے پھوکٹ[1] جرم گنوایا
بہو بھول بکار میں ماتا ؛ اور تفضیل میں مُہہ دھاتا
اور علم پڑھیا تمام سارا ؛ بن مرشد تھا بے یارا
وہ زہد شرع دہ زور ؛ پن دل کی بیتی اور
اور دائم صلاۃ صیام ؛ نہ بن بندگی دوجا کام
وہ جپے ورد مدام ؛ کچھ تاثیر مکھہ کلام
کرے جہد ریاضت ساری ؛ بن مرشد پرہیزگاری

وسے بولا بوے بول ؛ دل اندھا سینہ پھول
جوں علم ابلیس کیتا ؛ کیا فائدہ آخر لیتا

بے ارشاد خالی کام ؛ سب کھٹ پھٹ[2] دیکھ تمام
لی الیسی اُن مت پایا ؛ آپ کربھوں آپ سمایا

مرشد کی کیفیت یوں بیان کی ہے :-

یک مرشد مستحق ؛ در مستی مستغرق
وہ صاحب توحید ؛ اور تجرید کا تفرید
اور خلوت کرے مدام ؛ نہ کس سوں اس کا کام
وہ دوست حبیب اللہ ؛ کی مرشد ہادی اللہ
اُن سینا ایسا جیب ؛ اس دیکھنے کی طلب

اس کے بعد اُن کی بحث اور سوال و جواب شروع ہوتے ہیں، آخر طالب قائل

---

[1] فضول، مفت میں [2] بہت

جاتا ہے اور جب :-

اور ہوا تسلی دل ÷ ہور ہیا وصل مل
ان پایا انند سکھ ÷ تو بولیا اپنے مکھ
"میں ثابت لیا ایمان ÷ سب ٹوٹا مجھ گمان
مجھ کر سے لکے بھول ÷ جے حق لیا قبول
حق پایا جے مکھ تجھ ÷ من مراد حاصل مجھ"
یون کہہ پکڑیا پانوں ÷ مجھ تیری ہونا چھانوں"

اس کے بعد وہ جہل و الحاد کو ترک کر کے پیر کے گن گانے لگتا ہے۔ نظم کا خاتمہ ان اشعار پر ہوا ہے :-

یو (جانم) لکھیا بول ÷ لیہ یک یک معنا کھول
جی سنکر پکڑیا یاد ÷ لیا کیتا سب سواد
جے ہو دیں لوک عوام ÷ بے مرشد بے فہام
جے برتیں خود قیاس ÷ نہ بوجھیں راسک داس

اس نظم کے کل اشعار (۸۰۵) ہیں :-

(۹) ایک نظم اس نام سے ہے :-

"مسافرت شیخ خان میاں و بیان خلاصہ حضرت شاہ برہان صاحب"

خاں میاں، حضرت شاہ برہان کے مرید معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے جو جو مقامات طے کیے ہیں اور وہاں جو جو کچھ دیکھا ہے اُسے "مسافرت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ہر مسافرت کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ اس کے بعد "بیان خلاصہ" کے نام سے حضرت شاہ برہان نے اُن مشاہدات کی تعبیر کی ہے۔ جو خان میاں نے ہر ہر مقام پر دیکھے ہیں اور جنھیں وہ خود پوری طرح نہیں سمجھے لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ اشعار بجنسہ شاہ صاحب کے ہیں یا خان میاں نے اپنے پیر کے ارشادات کو نظم کر دیا ہے۔ قیاس یہ ہوتا ہے کہ خان میاں نے اپنی مسافرت لکھ کر دی یا بھیجی اور شاہ صاحب نے اس کے جواب میں اس کی تعبیر بیان کی۔ لیکن نظم کا خاتمہ پڑھنے سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا لکھنے والا یا مرتب کرنے والا کوئی شخص راجو نام ہے اور وہ بھی شاہ برہان صاحب کا مرید ہے چناں چہ وہ کہتا ہے :-

راجو بولے بیان خلاصہ حقیقت کی بات
خان میاں مسافرت کیتے بکیس اور سات
دل میں فکر کر اس کا معنا لکھیا میں کچھ یاد
دل کیاں آنکھیاں جس کون ہوئیں وہ سن ہوئے شاد

اس سے یہ امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ "بیان خلاصہ" کے نام سے جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ شاہ برہان کی تصنیف ہیں۔

(۱۰) ارشاد نامہ :

یہ شاہ برہان کی سب سے بڑی نظم ہے۔ اس میں تقریباً اڑھائی ہزار شعر ہیں۔ پہلے حمد میں کچھ شعر ہیں :-

اللہ سنوروں[۱] پہلیں آج ؛ کیتا جن یہ دھون جگ کاج
جگت کیرا توں کرتار ؛ سبھوں کیرا سر جنہار

ترلوک نرچے سمریں مل ؛ نت بکھانے ہو تلتل[۲]
سب جگ رواں[۳] رواں ہوئے کلام ؛ جیبن ہردم لاکھوں نام
سیت[۴] سمدر[۵] سیاہی بھریں
سب رو کو تکے قلم پھریں
دھرتی آکاس کیے پتر ؛ لیکھن بیٹھے کریں چتر
قیامت لگ جے کریں بھٹنت[۶] ؛ نا تجھ قدرت ہوئے گنت[۷]

ایسا رچیا دیکھ منڈان[۸] ؛ کیتا چندیں لکھ جہان

---

[۱] سراہوں [۲] ہر لحظہ [۳] رواں رواں [۴] سات [۵] سمندر [۶] بھٹکی [۷] گنتی [۸] گرد نیار کائنات

دھرتی کیتا اور اکاس ٭ سنگت دوجا نا اس پاس

چندر سورج چندیاں[1] سات ٭ کیتا مانس دین اور رات

اور ملائک حور پری ٭ یاران بحر خشک تری

رچیا دوزخ اور جنت ٭ نیکی بدی کیا گنت

اچھا[2] آپنی کیا جگت ٭ کس دیہ بندھن[3] کسی مگت[4]

سب کی پوُوے[5] من کی آس ٭ اچھیا لوڑیں[6] بھوگ بلاس

سب کی کیلی[7] تیرے ہات ٭ جوں تجھ بھاوے ہر بر[8] دھات

اس کے بعد نعت میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ مثلاً:۔

ختم نبوت جس کا نام ٭ بھیجا درود اور سلام

اب میں سنوروں کروں بکھان ٭ نازل ہوا جس فرقان

احمد محمدؐ جس کا نالوں ٭ روز قیامت اس کا چھالوں

پرگٹ کیتا جس اسلام ٭ دھوں جگ بھریں جس کا نام

نعت کے بعد اپنے پیر اور والد میران جی شمس العشاق کی صفت بیان کی ہے:۔

صفت کروں کچھ اپنا پیر ٭ جس تھی روشن ہوی ضمیر

دوہوں جگ مانجھ میت وہی ٭ سمروں لیہ من نیت دہی

تس کوں سمریں تن من شاد ٭ جس کا آہے مجھ پرساد

جگ میں آہے تھیں رتن ٭ ہردے میں لیہ کروں جتن

راکھیا کمندر کر اس ٹھانوں ٭ تل تل سمروں نیہ اس نانوں

پیر میران جی شمس العشاق ٭ دھوں جگ رب تجھ کیتا کشاف

شاہ میراں جی منجھ سہ پیر ٭ ہے گن[9] نتا گیان گمبھیر

آہے تیری یہ بنیاد ٭ چشتیاں کیرا ہے خانواد

جے کوئی آہیں اندر چشت ٭ ان کوں اگیں اہل بہشت

---

[1] منشا [2] مرضی [3] لگائی [4] تاج [5] پوری کرے [6] خواہش [7] کنجی [8] طرح، قسم

پیرو ہی منجہ ہے مرشید ٭ نت بکھانے ان توحید

سُمّیق کھولیں دل کے پاٹ ٭ روشن ہوے حقیقت باٹ

پیر کی صفت و ثنا کے بعد وجہ تالیف کے متعلق کچھ شعر لکھے ہیں. اس میں شاہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد اور والد ماجد کی طرح "ہندی" میں لکھنے کی وجہ اور معذرت کی ہے اور لکھا ہے کہ ظاہر پر نہ جاؤ اور باطن کو دیکھو. لفظوں کو نہ دیکھو اور معنے پہ خیال کرو. ہندی لفظوں میں کوئی عیب اور خرابی نہیں ہے. اس سے ظاہر ہے کہ ان کے زمانے میں عالم اور ثقہ لوگ اس زبان میں لکھنے سے احتراز کرتے تھے بلکہ عیب خیال کرتے تھے فرماتے ہیں:-

عیب نہ راکھیں ہندی بول ٭ معنے تو چک دیکھو ڈھنڈول

جو کے موتی سمد بھات ٭ ڈابر میں سچے لاگیں ہات

کیوں نہ لیوے اس بھی کھے ٭ سگھڑا[1] چطور[2] جے کوئی ہوت

ہیں سمند[3] کے موتی یوں ٭ گیان رتن کے جگتی یوں

گھڑیا یوہے شفقت سوں ٭ جتن راکھیں شفقت سوں

جیو کے منکے جلگے سوں ٭ محبت کے گیرے دھاگے سوں

موتیوں کیرا تھا انبار ٭ پرو کیتا بھاری ہار

گوہر جے کوی ہوے شناس ٭ سو ہی چن چن لیوے خاص

ارشاد نامہ اس کا نام ٭ لوڑے[4] فکر اسے مدام

ہندی بولوں کیا بکھان ٭ جے گر پرسار تھا منج گیان

اس کے بعد کتاب کے مضمون سے اطلاع دی ہے:-

شریعت، طریقت حقیقت سوں ٭ مجمع لیایا معرفت سوں

جے کچھ کیتا اس میں سوال ٭ جواب اپڑیا ہے در حال

اب اصل کتاب شروع ہوتی ہے. اس کی صورت بھی سوال و جواب کی ہے. سوال

---

[1] سیانا. [2] چتر. [3] سمندر [4] چاہے.

طالب کی طرف سے اور جواب مُرشد کی طرف سے۔ اس میں وہی باتیں ہیں جو صوفیا کے کلام میں بار بار دہرائی گئی ہیں، اور خود ان کے کلام میں بھی کئی بار آچکی ہیں۔ مثلاً حدوث و قدم، ذات و صفات، جبر و قدر، روح و نفس، کفر و اسلام، دوزخ بہشت، شہود و وجود، دیدارِ الٰہی، سلوک، عرفان اور مقام شیطانی وغیرہ وغیرہ۔

تصوف، ہماری ادبیات، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبے میں رچا ہوا ہے (شاید ہماری سیاسیات بھی اس سے خالی نہیں ہے)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لاش ہے جس میں روح کا نام نہیں اور جسے ہم صدیوں سے پیٹتے چلے آتے ہیں۔ یا ایک شان دار درخت ہے جو اندر سے کھوکھلا ہوگیا ہے۔ کہنے کو درخت ہے مگر صرف ایندھن کے قابل رہ گیا ہے۔ یا ایک خوب صورت اور نامور عمارت کا کھنڈر ہے جس کی تعریف کر دینا ہی ہمارے ذوقِ سلیم کی دلیل ہے۔ یا ایک قبر ہے جو اپنے پُرعظمت گنبد کی وجہ سے بچ رہی ہے۔ بہت سوں نے اسے اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ پیشے کی بدولت بہت سی مقدس چیزیں کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ بھی محفل کے گرمانے کے لئے ایک لطیفہ ہوگیا ہے۔ تصوف اب اس کا نام ہے کہ چند اصطلاحیں یاد کرلیں یا چند آسن یاد کر رٹ لئے اور نہیں تو کم سے کم لباس ہی میں جدت پیدا کرلی حسن و عشق کے چرچے میں جب کچھ مزا نہ رہا تو تصوف نے ہماری غزلوں میں چاشنی پیدا کردی۔ کسی شعر میں تصوف کی اصطلاح کا آجانا ہمیں وجد میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مایوسی اور ناکامی غفلت اور کاہلی کا سہارا اب یہی رہ گیا ہے۔ اور کیا ستم ظریفی ہے کہ ریا کا دشمن خود ریا کے لباس میں جلوہ گر ہے، اور اب تو اس کی لے اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ شاید چند روز میں ہمیں اپنی یونی ورسٹیوں میں اس کے لئے کوئی ڈگری قائم کرنی پڑے۔

غرض، تصوف ایک قسم کی روحانی منطق ہے جو لفظی داؤ پیچ اور مبہم بیانات کا مجموعہ ہو گیا ہے۔ اسی قسم کے بیانات اور لفظوں میں بھی ہیں جن سے نہ تزکیہ نفس کا مقصد حاصل ہوتا ہے، اور نہ اخلاق پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ مگر ہمیں ان مسائل سے کچھ بحث نہیں ہے۔ ہمیں اس کلام سے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مدد لینی ہے اور یہ ہمارے مقصد کے لئے کافی ہے۔

نظم کے آخر میں شاہ برہان نے اس کا سنہ تصنیف بھی بتادیا ہے اور جہاں تک کہ ہمارا

قیاس ہے یہ اُن کی آخری تصنیف ہے اور غالباً اسی سنہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اشعار جن میں اُن کے نام اور سنہ کا ذکر ہے، یہ ہیں :-

یہ سب بولیا ہے انجان ؛ عابد عاجز ہے برہان
ہجرت سنہ صد نو دمان ؛ ارشاد نامہ لکھیا جان

کتابت اس نظم کی ۱۳ صفر ۱۰۷۸ھ میں ہوئی۔

علاوہ ان نظموں کے شاہ صاحب نے بہت سے خیال دھرے بھی لکھے ہیں، جن کی ایک اچھی خاصی تعداد میرے پاس موجود ہے۔ ہر دھرے کے ساتھ اس کی راگ راگنی بھی لکھ دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو موسیقی سے خاص ذوق تھا۔ خاندان چشتیہ کے بزرگ موسیقی کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ روحانی ذوق پیدا کرنے اور روحانی مدارج طے کرنے میں اسے بہت بڑا ممد خیال کرتے ہیں۔ دھرے ہندی بحروں میں اور ہندی طرز کے ہیں، جن میں روحانیت اور عشق و محبت کا راگ الاپا ہے۔ البتہ ان میں بھی اُن کی دوسری نظموں کی طرح ہندی الفاظ اور اصطلاحات کے ساتھ کہیں کہیں فارسی اور عربی لفظ اور اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں اور جس طرح ظاہر میں ہندی، فارسی اور عربی کے میل جول کو ظاہر کیا ہے، اسی طرح باطن میں ہندو مسلم خیالات اور تہذیب کے ارتباط کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ صوفیانے ہندو مسلم تفرقے کے گھٹانے، امتیازات کے مٹانے، خیالات کی اصلاح کرنے اور آپس میں میل جول بڑھانے میں بڑا کام کیا ہے۔ جب سے اس فرقے کے ہادی پیشہ ور ہونے لگے اور اُن کے دلوں کی قوت گھٹ گئی، تو اُن میں وہ اثر باقی نہ رہا۔

خیالوں کے بعض اشعار نمونے کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں :-

اب سندیسا مجھ ہے شہ کا ؛ جب کب بھاگوں انتر ملے
پیر بھرم کے ہیٹے میرے ؛ نینو مانہ جوں کنکر سلے
نس دن جاگے برہ ماری ؛ نہ نیندا دیکھے نین پڑے
پلکھیں میری آگ بلے کیوں ؛ سپنے دیکھوں سمے کھڑے

قول پیا تجھ آس لگی من ٭ آس لگی تجھ پاس رہیں
جب کا جھالا تین مجھ آیا ٭ یک تل نہ مجھ ماس رہیں
نہ کا پیلیا مجھ کون لاگیا ٭ لوک دیوانی دیکھ ہنسیں
جگ کی ہانسیں کیا مجھ ہوے ٭ کہو سریجن کہاں بسیں
نس دن پیئے چنتا ٭ تن ماس سب گلے گا
گھڑی پرت سو میری ٭ سل دل کا سو سلے گا
جس بل سو دوکھ روتی ٭ نینو سو انجو جوتی
پلکاں سوں بند موتی ٭ گل ہار ہو ڈھلے گا
پئے کے سر چپ مکھ تھی ٭ گذری سو اپنی سوکھ تھی
شہ کے فراق دوکھ تھی ٭ تن من جیو جلے گا
پیئے مل مجھے لباری ٭ بیدھ عشق لگیا سو کاری
تلتل کروں سو زاری ٭ کیوں پیئے سوں ہٹ چلے گا

شاہ صاحب کے دوہروں کی نظم کی دو ایک مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

جب لگ تن نہیں چھوڑیا جیو کون تب لگ ہونا دور
جب لگ نظر نہیں چھوڑی آنکھ کون تب لگ ہونا نور
جب لگ سپنا نہیں چھوڑیا کان کون یو سب اعضا حال
جب لگ فہم نہیں چھوڑیا دل کون یو جہت ہو نرال
یوں سب تن میں من برتن دیکھ چھوڑیں لے سکھ دکھ
دکھ سکھ دونوں یک کری، تو پاوے سچ کا سکھ

پیاری توں کہہ نہ بھولی کس سنگ، تغیر دستا تیرا رنگ
جیوں آئینہ پکڑیا زنگ، عاشقی کے ایسے ڈھنگ

لہ چوٹ۔ چرکا

جس بھولی توں جگ بھلایا ایسی بھولی بھول
اُس بھولی سو بھول کھلے کبھیں نہ ہوئے ٹھول
اِدگ حور تھی اُس کا اوسول (اصول ؟)

بھولنا اُس کا جیوں زلیخا بھولی یوسف گیان
سب تھی اپسین دور کرنا کہی لائی اُسی سوں دھیان
توپائی سب میں مان پھر خالق نے کیا جوان

آکھیں (جانم) پرت سب میں ہے نہیں کوئی اس تھی بھار
اور ذرّا ہے سب میں ظاہر ساریوں اُدھار
کرو پرت یوں ہو بچار، عشق قوی ہے قائم قرار

ہولی پڑی اس نگر میں ساتی بچھڑیا میرا
پوچھیں سندیسا مجکوں حال کیا ہے تیرا وغیرہ

آپیں جوگی، سب جگ چیلا ؛ آپیں ایک نات رہے پکیلا
اپنی اچھیا کو سب چیلے نپایا ؛ نیکی بدی دے دوندے بچلایا
کلمہ نبی کا پنتھ مارگ لایا ؛ تن کا کنتھا کر سب چیلوں پہنایا
بندگی بھبوت کرنت اُٹھ لایا ؛ یقین جوگ ڈنڈا تکیہ تھا سا
لجیا کچھوٹی دے جندے پاسا ؛ اس تن کے مٹھ میں راول کا باسا
دھرتری پتر بھر بھوجن کیتا ؛ باول بھوڑوا کر پانی دیتا وغیرہ
میرے پیا کو پرت سوں کروں گی اپنا ؛ نس دن سیوا کروں گی جپنا
- - - - - - - ؛ جانم پیو سوں پرت جن لائی
سہدی سکھیاں میں اُن برپائی ؛ جن گھر پیا جی اس گھر بدھائی

---

۱ ذرہ ۲ منڈرے

جن دیکھی پیو اپنا اسے اور نہ بھاوے
دھوں جگ مانند دیکھتیں نہ کوئی پیو کے آوے
روپ کہوں تس پیو کا ناکوں خاطر لیا ہے
بن روپ جی آوے جانسی ناکوئی دیکھیں پاوے
ایسا مشکل بولتیں جسے وہی سمجھاوے

آگے جانم پیو آپ وہ بے مثل کہاوے
مجھ سوں مل ترے رنگ سوں بے رنگ جناوے
ہے کوئی گذرے آپ تیں پھیر آپ بجھاوے

آج کی رین سوہاگ کی سکھی شہو منائیں نہ کاہے
ایسی رین سو لکھنی پھر بھور نہ آوے

برہان شاہ صاحب کی نظم بالکل سادہ ہے جو اکثر صوفیا کا رنگ ہے، لیکن بعض مقامات پر سادگی کے ساتھ کلام میں شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے مثلاً:۔

بن عشق برہ کو سوج نہیں ؛ اور بن برہ عشق کی گوج نہیں

دکھ سوکھ بھانت ایسا بہاؤ ؛ بھری ندی میں جیسا ناو
یا جون چینڑے[1] کیری دھات ؛ ٹھٹے کھاوے نہتیں ہات

جے آپ کھوجیں پیو کو پائیں ؛ پیو کو کھوجیں آپ گنوائیں

روت کوئل کرے پکار ؛ مور ناچے پنکھ پسار

---

[1] گیند

یہ ایسا سیج سبھاؤ ٭ دیک اپنی اپنی چھاؤ
یہ سورج دیک تاپے ٭ چند چندنا ستیں راکھے
ان تاریان کا انبار ٭ دیکھ معلق پکڑیا ٹھار

کون اکاس میگھ بھراوے ٭ کون بارا دیکھ چلاوے
کون آسمان دیتا تان ٭ کون رچیا دھرت منڈان
کون معلق رچیا بارے ٭ چندر سورج دیکھ تارے
یوں جیتا مخلوقات ٭ یوں کل شے ہر ہر دھات
کون مارے کون جلاوے ٭ کون حکمت میں یہ آوے
دلیسرک مثلی جبان ٭ کہاں اُس کا پاویں ٹھان

بے مثل نا مانند کوچھ ٭ کہنے میں نہ آوے بوجھ
جس وہ جنا ئے یا دکھائے ٭ تو کچھ سمجھے دیکھن پائے
سمجھیا سونا کہنے جوگ ٭ دیکھیا سونا دیکھے بھوگ
کہنے آتے نہ سننے بات ٭ جس پر جوڑیا ہے ثبات
عارف سالک عاشق لوک ٭ وصال بن یہ سارے پھوک

اکثر نظموں کی بحر ہندی ہے اور زبان میں بھی ہندی کا رنگ غالب ہے. جو ابتدائی اُردو کا رنگ تھا. وہ اپنی نظموں میں ہندو مُسلم دونوں کے قصّوں اور روایات سے کام لیتے ہیں. اوپر کے ایک دوہرے میں یوسف زلیخا کی تلمیح پائی جاتی ہے ایک دوسری جگہ انھوں نے سری کرشن جی کے قصّے کی طرف اشارہ کیا ہے :-

سولا سہس گوپن کا نا بال برم توچاری
یو دیکھ بھوگ ابھوگی ہونا لوڑے گیان بچاری

وہ عروض اور نظم کے اصول و قواعد کی مطلق پروا نہیں کرتے. اکثر مصرع کو کھینچ تان کر سکتہ پورا کر لیتے ہیں. ضرورت شعری کے لئے لفظ کی ہیئت بدل دیتے ہیں. ساکن کو متحرک کو ساکن کر دیتے ہیں، اشباع اور امالہ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں.

میرے پاس کے مجموعوں میں حضرت برہان الدین کی غزلیں بھی ہیں. بجز اس کے ابھی میں یہ صحیح طور سے تحقیق نہیں کر سکا کہ یہ وہی برہان الدین ہیں، اس لئے میں نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے.

علاوہ نظم کے نثر میں بھی ان کے بعض رسالے ہیں، خصوصاً کتاب کلمۃ الحقائق جس کے میرے پاس دو نسخے ہیں، قابل ذکر ہے. یہ رسالہ اچھا بڑا ہے اور اس میں تصوف کے مسائل جواب و سوال کے طرز پر بیان کئے ہیں. شروع یوں ہوتا ہے:-

"اللہ کرے سو ہوے کہ قادر توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار، ہیچ ہیچ سو تیرا اٹھارو ہیچ ہوا بھی تو ج تھی بار. جد ہاں کچھ نہیں بھی تھا تہیں، دوجا شریک کوئی نہیں، ایسا حال سمجھنا خدا اتھی خدا کون جس پر کرم خدا کا ہوے."

کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ سوال اور جواب دونوں فارسی میں ہیں، مگر یہ بات کم ہے. تقریباً تمام کتاب دکھنی اردو میں ہے. عبارت کا نمونہ دکھلانے کے لئے دو سوال و جواب نقل کئے جاتے ہیں:-

"سوال — "یہ تن الادھا[1] دستا جیتا بکار سو ٹوٹے نہیں بلکہ ستر بکار روپ دستا ہے، یک تل قرار نہیں، جیوں مرکٹ روپ."

جواب — "اے عارف ظاہر تن کے فعل تھی گذریا و باطن کرتب دستے، اس کا نانوں سو ممکن الوجود. دوسرا تن سو بھی کہ اس ایندریں کا بکار چیشٹا کرنہار اسو وہی تن نہیں تو یو خاک دسو کہ دو کھ بھوگن ہارا. جیتا بکار روپ وہی دوسرا تن، تو توں نظر کر دیکھ یہ تن فہم سوں گذریا تو گن اس کی کیوں رہے؟"

سوال — "جوں باو آیا نکل گیا ولیکن جھاڑ کا ڈول تو رہا."

جواب — "صحیح، ولیکن پت جھڑی ہوے جھاڑ کوں تو بارا نا ہے، ایسے سب تیرے نفس کے فعل کے پات تیری روح کے سات لگے ہیں. وہ بارا سو نفس اس

---

[1] علاحدہ

سبب جھوے میں پڑیا تو پس وہاں کا بھی دیکھیں ہارا ہو. وہاں کے بکار روپ کا جیتا
چیتا ہوتا جہاں ہتی سوتح. دوسرا تن، وہ توں اس کا الادا دیکھیں ہارا، سو اس میں
نکوگن. ایسا بکار روپ سو روح کا مرکب. وہ جیا تن یہ دیباچہ اسی، اسی کا عکس
وہ تن قدیم میثاق کے وقت کا اول وہ تن بازدیہ تن اسی کا عکس یو، اتیال کے دیکھنے
میں اس کا عکس وہ. یو تن وقتی در میری عنصری کناری ہوتا ہے. وہ روحانی تن
ملائکان و حوران میں تن دھرتے ہیں وہت دقولیں میں تن دھرتے ہیں. وہ جیا
جز ناپاک بتوں کے یہ جیتا اس تن سوں. اس تن سوں شہوت، حرص، خمس کا مورچا.
اس کی صحبت سب اُسے ازار ہوتا ہے جیوں لوہا. صحبت میان بھوگنا، سونگنا، چاکھنا،
دیکھنا، یہ سب فعل سب اس تن کے یہ کیا بازدگیں سب رہے بلکہ زیارت دیکھلا
آئیں گے. ایسا قدرت خدا کا فہم میں آنا و نظر میں نہیں دستا و لیکن دل کا نظر باطن
اس میں آتا ہے تو توں اس کا فہم دار ہے عذر خ و بہشت، حساب سب اس سوں
تعلق دھرتا ہے. تا توں دستے سب فعل پر قادر ہو الا دہا، تو توں اس کا شاہد ہو
دجواب دیہ۔"

اب مجھے شاہ صاحب کے کلام کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے. اس سے قبل اس سلسلے میں دکنی
زبان کی بعض خصوصیات کے متعلق کئی بار لکھ چکا ہوں لیکن اس وقت مجھے دو ایک باتیں خصوصیت
کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے.

یہ بات ظاہر ہے اور کسی تفصیل کی محتاج نہیں کہ جو زبان ہم بولتے ہیں او
ہے اور
جسے اس وقت اُردو کہتے ہیں وہ ہندی ہی سے نکلی اور ہندی ہی سے بنی
ہے. ابتدا میں بڑا فرق
جس سے اس کی الگ حیثیت قائم ہوگئی، یہ تھا کہ یہ فارسی حروف
بانی تھی مگر نام اس کا
بھی ہندی ہی رہا. اور قدیم اُردو کی کتابوں ہی میں نہیں
بہت مدت بعد تک یہ زبان ہندی
کے نام سے موسوم رہی. چنانچہ میر حسن دہلوی نے جو
شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اُسے وہ اپنے
دیباچہ میں "تذکرہ سخن آفرینان ہندی زبان"
بولتے ہیں. ریختے کا لفظ بعد میں آیا ہے. جب یہی
زبان دکن میں آئی اور اس میں دکنی نے
داخل ہوا تو دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو اسی

سن لعبد اللہ

خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی۔

شاہ برہان صاحب نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ مثلاً وہ کتاب حجت البقا میں فرماتے ہیں :۔

جے ہوویں گیان بچاری ، نہ دیکھیں بھاکا گجری

یعنے جو صاحب عرفان ہیں وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کریں گے۔ ایک دوسری جگہ اپنی کتاب "ارشاد نامہ" میں مرشد کی زبانی لکھتے ہیں :۔

یہ سب گجری کیا زبان

کر یہ آئینہ دیا نشان

نثر کے رسالے "کلمۃ الحقائق" میں بعد حمد و نعت یوں لکھا ہے :

"سبب ، یو زبان گجری ، نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق"

اگرچہ وہ ایک جگہ (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) وہ اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں ، لیکن خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے اُن کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان جس میں اُن کا کلام ہے ، ہندی ہے ، لیکن گجری ہندی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زبان پر گجرات کا اثر ہے اور یہ قدرتی بات ہے۔ ہندی کہو یا اُردو ، یہ جہاں گئی ، مقامی رنگ کی جھلک اس میں ضرور آ گئی ہے۔ چند مثالیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) اچھنا اور اس کے مشتقات اچھے ، اچھو ، اچھے ، اچھوں ، اچھتا ، اچھے گا گجراتی چھے کا اثر ہے۔

(۲) ہمیں ہمنا گجراتی ہمنے کا اثر ہے۔ ہمنا کی طرح ہم نے بھی گجراتی میں فاعل اور مفعول دونوں حالتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳) "اپن" ، ہم کے معنوں میں گجراتی ہے۔

(۴) "موح" حرف تخصیص کے طور پر دکنی میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے اور یہی استعمال اس کا گجراتی اور مرہٹی میں ہے۔ مثلاً "جو کوئی داتا ہے نا اس کا ایسا ہچ کام ہے ، جو بڑے پیٹ کا آدمی ہے نا وہیچ کرتا ہے۔"

(۵) گھٹنا (وقت گزرنا)، سوسنا (برداشت کرنا)، ابھال (بادل)، ایلاڑ (ورے)، پیلاڑ (پرے)، انجھو (آنسو) ندرا (نیند) وغیرہ الفاظ خاص گجراتی ہیں اور قدیم دکنی میں بہ کثرت اور بلا تکلّف استعمال ہوتے ہیں۔

(۶) "سی" قدیم دکنی میں مستقبل کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسے کرسی، جاسی۔ یہ استعمال سب رس اور بعض دوسری کتابوں میں صرف واحد حاضر کے صیغے کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن شاہ برہان نے اس کی دوسری صورتیں بھی استعمال کی ہیں۔ جیسے، ہمیں نا کرسیں، نا دیکھ سوں، کرسوں، کہہ سکوں۔

یہ لاحقہ ہندی زبان کی مختلف زبانوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا چہ پنجابی میں ماضی تمنّی اور مستقبل کے لیے آتا ہے، مشرقی راجستانی میں بھی مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (اسی، سوں، ساں، سو) اسی طرح ریواڑی اور بھوج پوری زبانوں میں بھی لہجے کے کسی قدر اختلاف سے یہ استعمال مستقبل کے لیے اب تک رائج ہے۔ گجراتی میں یہ "شے" ہے۔ جیسے، کوشے (کرے گا) کرش، جشے (جائے گا) آوشے (آوے گا)، اصل میں یہ لاحقہ پراکرت کا ہے، جہاں یہ سُس، سامی، سی وغیرہ کی صورت میں استعمال ہوتا تھا۔ سورسینی میں بھی، جس سے برج بھاشا، گجراتی وغیرہ زبانیں نکلی ہیں، یہ لاحقہ اسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اپ بھرنشا (بگڑی ہوئی پراکرت) میں اس کی صورت سوَن، سیوں، سسی، سے، سَی وغیرہ ہے۔

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدیم دکنی پر اور خاص کر اس زبان کے اس شاخ پر جو گجرات اور بیجاپور میں بولی جاتی تھی، گجراتی زبان کا اثر پڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے بعض اوقات گجری سے موسوم کیا جاتا تھا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ شاہ برہان کی نظم سادہ ہے۔ وہ قافیہ وغیرہ کے قواعد پر پورے عامل نہیں، ضرورت شعری کے لیے لفظوں کو توڑ موڑ دینا، متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک کر دینا اُن کے لیے کوئی بات نہیں۔ اشباع، امالہ، ترخیم سے بلا تکلف کام لیتے ہیں۔ قافیے میں وہ آواز کا خیال کرتے ہیں، تحریر کی پروا نہیں کرتے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آوازیں بھی یکساں نہیں اور بہت کم تشابہ ہے، تو بھی وہ بلا تامل قافیہ باندھ جاتے ہیں مثلاً خالق کا قافیہ مالک اس جیلد

پیدا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں "ق" کا صحیح مخرج نہیں ادا ہوتا اور "ق" اور "ک" کا یکساں تلفظ کیا جاتا ہے لیکن ناوک کا صادق، فرق کا طرف، عشاق کا کشاف یا شرف کا فرق کیوں کر قافیہ ہو سکتا ہے۔ آخر شاہ صاحب بلا تامل لکھ جاتے ہیں۔ صوت کی بنا پر انھوں نے پاس کا خاص اور [illegible]ان کا خاص قافیہ لکھا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی [illegible] انصاف کا قافیہ پاس بھی باندھتے ہیں، شاید اس لئے کہ یہ حرف قریب المخرج ہیں مثنوی کے قافیہ کے لئے وہ رُخ کو روخ کر دیتے ہیں۔ دکن اور بعض دیگر مقامات میں "خ" کا تلفظ "ق" کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ عوق کا قافیہ روخ لکھتے ہیں تقصیر کے قافیہ کے لئے وہ ڈھیر کو سیر، ڈھیر کے لئے فکر کو فکیر، قید کے لئے مستعد کو مستید کہتے اور سیس کے لئے مفلس کو مفلیس کر دیتے ہیں۔ عربی الفاظ میں ح، ع جیسے حروف کا تلفظ (جب کہ وہ آخر میں ہوتے ہیں) اکثر اہل ہند ادا نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے اسی بنا پر گرد کا قافیہ شرو (شروع)، صحی (صحیح) کا قافیہ کوئی باندھ دیا ہے۔ اور آخر سے "ع" اور "ح" اڑا دی ہے۔ اور وجہ معقول ہے۔ ایک جگہ حقہ کے قافیے کے لئے لقا کے "ق" کو مشدد کر دیا ہے۔ دکنی کی اکثر نظموں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔

(رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۳ء)

حضرت شاہ امین الدّین اعلیٰ

آپ شاہ برہان الدّین جانمؒ کے فرزند ہیں اور اپنے والد کی وفات کے بعد تولد ہوئے۔ مادر زاد ولی سمجھے جاتے تھے اور ان کی کرامات کے تذکرے کتابوں میں بہت پائے جاتے ہیں جو ہماری بحث سے خارج ہیں۔ اس پر سب تذکرہ نویسوں کو اتفاق ہے کہ یہ ولیٔ کامل اور مجذوب واصل تھے۔ اور با وجود جذب کمال اور محویت کے معارف و اسرار کی تلقین فرماتے تھے۔

ارکان شرعی اور صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔ لکھا ہے کہ سید محمدؔ بخاری جو اس زمانے کے بڑے عالم اور جامع شریعت و طریقت تھے، جب انھیں یہ اطلاع ملی تو وہ چند اور عالموں اور بزرگوں کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بزرگانِ دین باوجود شہود و استغراق اور محویت کے ارکان شرع کو ترک نہیں کرتے تھے، آپ کا یہ فعل مناسب اہلِ طریقت اور شایان اداب شریعت نہیں ہے۔ آپ نے یہ سُن کر اپنے ایک خلیفہ کو شاہ پور کے تالاب کے وسط میں (جو اُس زمانے میں پانی سے لبریز رہتا تھا) مصلیٰ بچھانے کے لئے فرمایا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور آپ نے وہاں جا کر دوگانہ ادا کیا۔ سب علمار حیران رہ گئے اور چُپ چاپ چلے گئے۔ بعض نے اس روایت کو کسی قدر اختلاف سے بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک روز بیجا پور کے علمار سکندر شاہ ثانی کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور اس معاملے میں اس سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے یہ حکم جاری کیا کہ یا تو شاہ صاحب نماز پڑھیں ورنہ شرع کا حکم اُن پر جاری ہوگا۔ خادموں نے اس کی اطلاع حضرت کو نہ دی۔ اس کے بعد بادشاہ کا حکم ہوا کہ خادموں کو مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی جائے اور شہر کے دوکان دار کوئی چیز ان کو نہ دیں۔ آخر خادموں نے عاجز آکر عرض کی۔ فرمایا "کل سے احکام شرع کی اتباع کروں گا۔" سب تالاب کے کنارے حاضر رہیں۔ چناں چہ دوسرے روز بادشاہ اور تمام علما تالاب کے کنارے حاضر ہوئے۔ آپ نے تالاب پر مصلّٰی بچھانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے سب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو صاحب میرے امام ہوں وہ تشریف لائیں۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ آخر آپ نے تنہا دوگانہ ادا فرمایا۔

آپ کے خلیفہ بہت سے ہوئے ہیں۔ ان میں شاہ میراں جی سیّد حسن خدانما (حیدرآبادی) سیّد خداوند خدانما (چو ... والے) اور تاولنگا انکل کوتال (شاہ عبدالقادر لنگ بند) زیادہ مشہور ہیں۔

وفات ۲۲۔ رمضان ۱۰۸۶ھ میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ ختم ولی ہوا ہے۔ اور ایک شاعر نے بھی تاریخ کہی ہے۔ مادۂ تاریخ کا شعر یہ ہے۔

تاریخ وداسم وخطاب از ہاتفم آمد ندا
شاہ امین الدّین اعلیٰ فرد قطب الاولیا

دوسرے مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے۔ تذکرہ اولیا دکن میں جو تاریخ وفات ۱۱۱۶ھ اور مادۂ تاریخ ختم الولی (۱۱۱۶ھ) لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

دکنی اُردو میں اُن کا کلام کثرت سے ہے جس کا ذکر ان اوراق میں کیا جاتا ہے۔

اِن کا جس قدر کلام مجھے ملا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) قصیدہ در مدح حضرت شاہ برہان۔ نمونے کے لئے اس کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ قصیدے کے عنوان میں یہ شعر ہے:۔

برہان بن میراں اُپر تن کفش جان صدقے کروں
احسان مقابل بھی نہیں تیغ تھا نے وکیے آگل دھروں

برہان حجت نام ہے، در دین پیش اقدام ہے
اسرار حق با نام ہے، برہان بن میراں اُپر

اکمل ولایت تج عطا، ثابت ثبوت نافی خطا
جز عین حق دیگر نہ تھا، برہان بن میراں اُپر

علم لدن مقدور تج نکتے خفی مکشوف تج
اشکال مشکل حل تج، برہان بن میراں اُپر

آخری شعر یہ ہے:۔

آکھیں امین خادم کمین، دم دم سرن کل بر زمین
مقبول ہو گفتار امین، برہان بن میراں اُپر

(۲) کتاب محب نامہ (یا محبت نامہ) یہ نظم بھی قصیدے کے طرز میں ہے مگر عاشقانہ رنگ میں ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔ قافیہ تو ایک ہی ہے لیکن ردیف کی پروا نہیں کی جو زبان سے نکل گیا وہی لکھ دیا:۔

تمریں نین تیرے ساحر ہوے ہوں کون
گمراہ کر بھلاوے قوس قزح بھوں کون

پیچوں بھریاں زلف تج موجوں ڈبے بجز موں
ہر ہو پڑ کرشمہ عشاق کے ریجن کون

راہ صراط پُل جوں سرانگ جو چھپی ہے
کاہے کشاں سما پر محب بلاوتے کون

یسما عرش علامت کرسی مکٹ سہاوے
روشن شمع منوّر پروانے جالنے کون

دنداں مثال بجلیاں رخشاں کلام کرتیں
زہرہ دھرے نہ ویخ خوبیں بجھانے کون

چاہ زنخ کا تیرا مانند حوض کوثر
مقتول ہیں جو تیرے انکار نے غسل کون

اسی طرح سراپا بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

تیرا قدم مبارک سوں سب ظہور جلو کے
قصد قدم کیا جب اوّل توں آوے کون
فیضوں قدم کے ترے پُر نور ہر حالت
اے صاحب جمالہ یو فیض تج قدم کون
چرخ فلک کو اک گرداں ہیں تج خدامت
ملزوم کر لئے ہیں سجدے ترے قدم کون

آخری شعر یہ ہے:۔

اکھیں امین جے کچ اپنے قدر قیاسوں
بے باک باکہ سیتی بخشنگے ہے تو ہم کون

(۳) رمز السالکین یا رموز السالکین:۔

اس نظم میں وحدۃ اور نور و روح اور دل و نفس پر بحث کی ہے۔ ابتدا یوں کی ہے:۔

اللہ پاک منزہ ذات ⁂ اسوں صفتاں قائم سات
علم، ارادت، قدرت، بار ⁂ سنتا، دیکھتا، بولنہار
ہے صفت یہ جان حیات ⁂ اس کوں ناہیں کہے ممات
ایساں صفتاں سوں ہے ذات ⁂ جوں کے چندنا چاند سنگھات

اس طرح وحدۃ الوجود، فراق و وصال، فنا و بقا وغیرہ کے مسائل بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں ادنیٰ اور اعلیٰ عاشق، اور نبوت اور ولایت کا فرق یوں بیان کرتے ہیں:۔

ادنیٰ عاشق اعلیٰ بوج ⁂ یہ دو مقصود آکھوں رنج
عاشق ادنیٰ جوں پتنگ ⁂ اعلیٰ موم بتی کا رنگ
جوں پتنگا دیکھ پڑتا نا ⁂ آپ جل کر ہوے فنا
وے ولایت جوں پتنگ ⁂ موم بتی یہ نبوت رنگ
یہ سب بوجھے اس کا سوز ⁂ نو جیے مجلس شب اور روز

آخر تو ہے فنا نہات[1] ٭ اِس کی اُس کی یکھی بات
پتنگ دیوانہ جیسے تھی ٭ نا سد جانے ملنے کی
قومی ولایت اُس کی ہوے ٭ جے تابع نبی برتے کوے

آخر کے اشعار یہ ہیں۔ اس میں کتاب کا نام اور اپنا تخلص دونوں آگئے ہیں :۔

نادر رموز السالکین ٭ سالک بھر دیکھ لاوے یقین
واصل شکر ہوے فدا ٭ عاشق خود تھی ہوئے جدا
عارف جے ہیں با عرفان ٭ حیرت میں ڈوب ہوے حیران
طالب سن کر اگلا شوق ٭ اُمید راکھے حق کے ذوق
جس کوں اللہ دیوے راہ ٭ اس کوں دیوے سب سمجھاہ[2]
بندا لوڑے اُمید وار ٭ حق کی درگاہ دیکھ بچار
ڈر اُمید میں پکڑیا ٹھاؤں ٭ ہر دم جپیں اس کا ناؤں
حق کی راہیں پکڑ یقین ٭ کیوں نا اس کوں ہوے لیین
ہمت اُس تھی کیا تمام ٭ حق تھی بولیا حق کلام

(۴) ایک نظم وجودیہ ہے جس میں روح اور وحدۃ الوجود اور دیگر مسائل کا ذکر ہے بیچ میں کہیں کہیں بعض اشعار کی تشریح فارسی نثر میں کی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں :۔

نفس کا دوڑ نا ہی اسطار ٭ یو تو آہے نفس بے چار
نفس کو لیا وے تو دمکی جاگا ٭ لائیں ذکر نہیں تو جاوے بھاگا
روح کو سہج من رکھیں رے ٭ ہور تکل پیو کوں مانگیں رے
عقل ہوش دل کر رکھوال ٭ جے محبت نالے کس حال
روح کون پادشاہ جان ٭ عقل روح کی ہے پردہان

(۵) ان کے علاوہ اور نظمیں بھی اسی مضمون کی ہیں، جن کی تفصیل غیر ضروری ہے :۔

اس قسم کی نظموں کے سوا دھرے بھی بہت سے ہیں۔ اور ہر دھرے کا ساتھ اس کی راگنی بھی لکھ دی ہے۔ اس سے ذوقِ موسیقی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس خاندان کی خاص صفت ہے۔ مثال کے

---

[1] نہایت [2] سمجھا

طور پر ایک دوہرا نقل کیا جاتا ہے :-

مرنا ہار، جیونا بسار ؛ جیونا ہار، مرنا بسار

سودہ سوئے سجن کی دیکھ بچار

لال سوئے سجن دیکھیں پاوے ؛ آپس میں دیکھ آپ گنواوے

من رانی حضرت قول بھاوے

لالن کی صورت ایکانہ پاوے ؛ سب سوں بن سب سہج اوگاوے

روپ اروپ چھیک بہاوے

جانم حال سوز بھراوے ؛ حق کے تولوں حق ڈولاوے

آکھے شاہ امین علی گیان ہراوے

بعض دوہروں میں عربی الفاظ کثرت سے ہیں مثلاً :-

نبی پر گٹ ذات ظہور ہے ؛ معشوق حق اللہ نور علی نور ہے

حقیقت حقائق ذات کمال ہے ؛ صورت معنی ذوالجلال ہے

دُرود نبی پر شب معراج ہے ؛ ساری اُمّتوں نت جم کاج ہے

سبھوں پر شاہد ذات رحمان ہے ؛ آکھیں علی امین الدین گنج لسان ہے

لیکن ایسے دوہرے کم ہیں :-

(۶) ایک بات نئی ان کے کلام میں یہ پائی جاتی ہے کہ بخلاف اپنے والد کے اُنھوں نے ریختے میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ ایک غزل تو بالکل اس زبان میں ہے جسے ابتدا میں ریختہ کہتے تھے، یعنی آدھا مصرع فارسی اور آدھا ہندی، چناں چہ ایک غزل کے، جس کے عنوان پر خیال ریختہ لکھا ہے، چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

ضمیرم زار کان دل یار منجسوں بات کرتا نہیں

یہ بینم راہ اے شہنشاہ یک تل آ کے جاتا نہیں

تماشم جز تو اے رعنا منجے کی جا لتا را جے
دلم پر خون جگر فاسد تبھی تج مہر آتا نہیں

ز دستم رفت عنان صبر رہیا نا ہوش منج میرا
بیا اے ماہ ظلما تم دھرک دل کوں کی دیتا نہیں

چرا ایں قدر مستغنی ہوا تو منجھتے اے پیارے
ایا وقت کدام آید کہ منج تج بیچ پردا نہیں

محض فریاد می دارم کہ تج سنگ میاں اچھنے کوں
امین گوید بیاں ہجر بن ساقی نیارا نہیں

ایک دوسری غزل اور بھی ہے، لیکن اس میں ریختے کی یہ ابتدائی شان نہیں پائی جاتی، یعنی اس میں آدھی فارسی آدھی ہندی نہیں ہے۔ ردیف اس کی امین ہے مگر قافیے کی پوری پابندی نہیں کی۔ کہیں "کاجین" ہے تو کہیں "تون"، کہیں "پرکار" ہے اور کہیں "بابیک" وغیرہ یا تو شاہ صاحب نے قافیہ بالکل اڑا دیا ہے یا یہ کہ کاتبوں نے ایک ہی بحر کی مختلف غزلوں کو ملا جلا دیا ہے اس غزل کے بھی چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

دل بحر میں غواص ہو روح صدف کے کاجین لین
بے باہ در تس صدف میں تو رجان توں، ہجین امین

گرگیاں کے عرفان سوں سنبھال سینے چیر کر
موتی مرین ہات لیہ عرفان انگوں پرکار امین

اس ذوق کی تمثیل کون کس سوں کیا کر کہوں
نا ہر کسی زہرا تہاں نا آوے کہ سکتا امین

بے چارہ لیو وسواس سب پردا اہے تج اوس میں
مردان حق تن نام ہے جن ہیم اوس بیٹھا امین

تمت کیا یک غزل میں ابیات خامی تیج دہ
مفہوم کر ستار ہونا عیب جو ہونا امین

یہ پندرہ شعر کی غزل ہے، چناں چہ آخری شعر میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

(۷) شاہ صاحب نے بعض رسالے نثر میں بھی لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا رسالہ گفتار حضرت شاہ امین کے نام سے ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ ایک دوسرا مختصر رسالہ گنج مخفی نام ہے۔ اس میں شاہد و شہود کی بحث ہے۔ نمونے کے لئے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنے چاہا تو اول اس میں سوں یک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھو ہوا، امین شاہد کہتے ہیں تو دونوں ذات کے دو طور ہیں' ذات نے آپس کو دیکھا، اُسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اُسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

حضرت شاہ امین کی زبان اپنے دادا شمس العشاق میراں جی اور اپنے والد شاہ برہان سے بھی کسی قدر سادہ ہے۔ زبان کی خصوصیات وہی ہیں جو شاہ برہان کے ذکر میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہیں، اور یہاں ان کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ ان کے خاندان میں تالیف و تصنیف اور شاعری مدت تک قائم رہی اور ان کے بعض مرید بھی مؤلف اور شاعر ہوئے ہیں۔ ان کا مختصر سا ذکر آئندہ کسی وقت کیا جائے گا۔ (رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۸ء)

گجری یا گجراتی زبان

- شاہ علی محمدؒ جیو گام دھنی
- میاں شیخ خوب محمدؒ چشتی
- حسن شوقیؒ
- قاضی محمود دریائیؒ

شاہ علی محمد جیو گام دھنی

آپ کا سلسلۂ نسب سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے اور ننہیال کا سلسلہ حضرت محبوب سبحانی سے ملتا ہے۔ بقول صاحب تحفۃ الکرام آپ سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں مگر ابن الحسن شیخ محمد جنھوں نے آپ کے کلام کو مرتب کیا ہے، شاہ عمر کا پوتا بتاتے ہیں اور چوں کہ وہ اپنے آپ کو "یکے از کمینۂ مریدان وخاک ربان تاج العاشقین شاہ عمر مظہر اللہ" کہتے ہیں اس لئے ان کا بیان زیادہ قابل وثوق ہے۔ آپ کا مولد ومنشا احمد آباد گجرات ہے۔ آپ نے علمائے گجرات سے تحصیل علم کیا اور اپنے والد قطب العالم شاہ ابراہیم جمال اللہ سے خلافت حاصل کی۔ آپ گجرات کے کامل عارفوں اور درویشوں میں سے ہیں اور اہل گجرات پر آپ کی تعلیم وہدایت کا بہت اثر تھا۔

صاحب تذکرۂ اولیائے دکن کا بیان ہے کہ محمد غوث گوالیری، گوالیر سے گجرات آئے تو آپ سے ملے اور آپ کے کمال کو تسلیم کیا۔ تذکروں میں آپ کی کرامات کا ذکر بھی آیا ہے۔

اسی تذکرے کا مؤلف لکھتا ہے کہ "گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا" یعنی گاؤں کے مالک ہیں۔ جس طرح مالک اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح آپ بھی گجرات کی حفاظت فرماتے تھے، گویا آپ کی برکت سے گجرات محفوظ ہے۔

آپ کا کلام جو دیوان کے نام سے مشہور ہے آپ کے دادا کے مرید اور آپ کے معتقد

ابن الحسن شیخ محمد ابن (ابو) عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی نے جمع کیا ہے اور اس پر مختصر سا ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

" ابن الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی کہ مکاشفات حضرت بندگی سیدی و مرشدی و شیخی و شیخ العالم المخاطب بہ حضرت اللہ تعالیٰ بجستہ عشر خطایا ...... بلسان دُربار و جوہر نثار بطریق نظم بزبان مبارک خود فرمود، در اثبات توحید و وجود واحد با دلائل عقلی و برہان نقلی و تمثیلات آں و اسرار اللہ تعالیٰ دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ شد و آں ملفوظ را بہ کتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتم "

پروفیسر شیرانی صاحب نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں اس کتاب کے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے، ایک میں مرتب کا نام بجائے ابن الحسن شیخ محمد کے شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن شیخ محمد اور شیخ حبیب اللہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ یا تو ابوالحسن شیخ محمد کی جگہ شیخ حبیب اللہ سہواً لکھا گیا ہے یا ممکن ہے کہ شیخ حبیب اللہ نے یہ مجموعہ بطور خود الگ مرتب کیا ہو، دوسرا نسخہ جو شاہ علی جیو کے پوتے سید ابراہیم بن شاہ مصطفیٰ کا مرتب کردہ ہے، یہ نسخہ میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ اس میں سید ابراہیم نے ذکر کیا ہے کہ مجھ سے قبل اس کلام کا ایک نسخہ ابوالحسن شیخ محمد بن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی نے مرتب کیا تھا، لیکن بعض طالبان وجود واحد نے مجھ سے یہ کہا کہ ابوالحسن شیخ محمد کا دیباچہ بہت مختصر ہے، تم ایک دوسرا دیباچہ لکھو۔ چناں چہ اس درخواست کی تعمیل میں اُنھوں نے دوسرا دیباچہ لکھا۔ مگر اس دیباچے میں سوائے ابتدائی عربی خطبے کے کوئی چیز نئی یا زائد نہیں معلوم ہوتی۔ اصل کلام وہی ہے جو ابوالحسن کے مجموعے میں تھا۔ اس میں "بطریق نظم" کے پہلے "بالفاظ گوجری" کے الفاظ بھی درج ہیں۔ میرے نسخے میں لفظ "نظم" کے بعد چند الفاظ کسی نے سیاہی سے اس طرح مٹا دیئے ہیں کہ پڑھے نہیں جاتے، ممکن ہے کہ یہ "بالفاظ گوجری" ہی کے لفظ ہوں۔ سیاہی کے رنگ سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ بعد کی کارستانی ہے۔

شاہ علی جیو کی زبان گجُری ہے جیسا کہ اُن کے کلام کے ایک مرتب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔ جس طرح دکن میں آکر اُردو کی ایک شاخ دکھنی ہوگئی، اسی طرح گجرات میں آکر اس کا نام گجُری ہوگیا۔ گجُری سے مطلب اُردو کی اس شاخ سے ہے جو گجرات میں بولی جاتی تھی اور جس میں مقامی گجراتی لفظ بھی مل جُل گئے تھے۔

یہ زبان اول تو اُن اولیاء اللہ کے فیضان کا اثر ہے، جو اشاعت اسلام کی خاطر اس علاقے میں جابجا پہنچے۔ خصوصاً احمد آباد اور پٹن تو ان بزرگوں کے مزاروں سے پٹا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ پٹن بقول صاحب مراۃ احمدی پیران پٹن کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ دوسرا اثر سلاطین کا ہے۔ مسلمان سلاطین میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا۔ جس طرح اس نے اوّل اوّل دولت آباد پر چڑھائی کر کے اسے فتح کیا تھا اسی طرح سنہ ۶۹۶ھ میں گجرات پر تسلط کر لیا اور اپنی طرف سے صوبہ دار مقرر کر دیا۔ یہ صوبہ دار برابر اس کے جانشینوں کی طرف سے بھی مقرر ہوتے آئے، یہاں تک کہ جب دہلی پر تیمور کا لشکر پہنچا اور وہاں کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا تو صوبہ دار ظفر خاں کے بیٹے تاتار خاں نے خود اپنی حکومت گجرات میں قائم کر لی اور محمد شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ (۸۰۶ ہجری) شاہان گجرات کی حکومت اکبر کے عہد تک رہی۔ پھر گجرات کا صوبہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہوگیا غرض دہلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے زمانے سے تھا۔ دوسرا اثر صوفیا کا تھا جو اسی زمانے سے بلکہ اس سے قبل یہاں پہنچ گئے تھے اور تلقین و تعلیم اسی زبان میں کرتے تھے۔ اس زبان کا اثر گجرات سے سلطنت بیجاپور اور دور و نزدیک مقامات میں پہنچا۔

میں اس رسالے کے گزشتہ اوراق میں میراں جی شاہ اور اُن کے خلفا یا اولاد کے حالات میں اس کا اشارہ کر چکا ہوں۔ یہاں اس خیال کی تائید میں ان کے کلام سے چند شہادتیں پیش کی جاتی ہیں:۔

"یوں زبان گجُری نام" (کلمۃ الحقائق، تصنیف حضرت شاہ میراں جی سنہ وفات ۹۰۲ ہجری) ——

"جے ہویں گیان بچاری، نہ دیکھیں بھاکا گجری
جس ارتھوں کیرا فہام، کیا بولوں سوں ہی کام"

(کتاب حجت البقا، تصنیف شاہ برہان الدین جانم سنہ وفات ۹۹۰ ہجری)

یہ سب گجری کیا زبان   کریہ آئینہ دیا تھا

(کتاب ارشاد نامہ، تصنیف شاہ برہان الدین جانم)

گجرات کا صوبہ ایک زمانے میں بہت وسیع تھا اور جودھپور سے لے کر مالا بار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں تقریباً سترہ بندگاہ تھے۔ ان میں سورت بہت بڑا اور مشہور تھا اور تجارت کا خاص مرکز بن گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان یہیں سے حج کو جاتے تھے، اور ہر سال ملک سے دور دور کے مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے۔ غرض شمالی ہند کی زبان کا جو اثر اس علاقے کی زبان پر پڑا وہ اس وسیع صوبے کے ہر گوشے اور آس پاس کے اضلاع تک پہنچ گیا۔

اسی زبان میں شاہ علی جیو کا کلام ہے۔ اس میں توحید اور وحدت وجود بھرا ہوا ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس رنگ میں مگن ہیں اور جب اس مسئلے کو بیان کرتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے، جیسی ان کی زبان سادہ ہے ویسا ہی اُن کا اسلوب بیان بھی سیدھا سادہ ہے اور اگرچہ وحدت وجود کے مسئلے کو وہ معمولی باتوں اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں، مگر ان کے الفاظ اور بیان میں پریم کا رس گھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے اور اپنی محبت کو طرح طرح سے جتاتے ہیں۔ طرز کلام ہندی شعرا کا سا ہے۔ زبان اُن کی سادہ ہے، لیکن چوں کہ پرانی ہے اور اکثر غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس لئے آج کل اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ شاہ صاحب کا انتقال سنہ ۹۷۳ ہجری میں ہوا اور ان کا کلام اُس وقت کی زبان کا اچھا نمونہ ہے۔ یہاں مختلف مقامات سے ان کا کلام نقل کیا جاتا ہے، جو اشعار مشکل ہیں اُن کے معنے بھی دیدیے گئے ہیں۔ نقل کرنے میں الفاظ کی شکل و صورت وہی رکھی گئی ہے۔ جو اصل کتاب میں ہے۔

ابتدا اِن اشعار سے ہے :-

آپین کھیلوں آپ کھلاؤں　　　آپین آپس لیکل لاؤں

(پہلا مصرع صاف ہے۔ دوسرے کے معنے ہیں "آپ ہی اپنے کو گلے لگاؤں")

میرا ناؤں منجات بھاوے　　　میرا جی سنجھے پر چاوے

میری نیہ منجھی سوں ماوے　　　دھری اپنیں روپ لبھاوے

(دوسرا شعر۔ میری محبت مجھی میں سمائے اور میں اپنے حسن پر خود ہی فریفتہ ہو رہی ہوں)

کہیں سو مجنوں ہو پرلاوے　　　کہیں سو لیلیٰ ہوے دکھاوے

کہیں سو خسرو شاہ کہاوے　　　کہیں سو شیریں ہو کر آوے

("پرلاوے" یعنی فریفتہ ہو)۔

کہیں سو ساقی کہیں علی جیو　　　علی محمد کہیں کہاوے

کہیں سو شاہ حسینی راجا　　　ایوین تل تل بھیس پھراوے

(ایوین = اسی طرح، تل تل = لحظہ بہ لحظہ، پھرادنا ——— پہنا یا بدلنا)

اٹھر پر ڈالی چک اُرتنالی　　　بینی باسک ہور تل کالی

ایہہ جیو مانگیں بھویں ڈُمالی

(یعنی پان سے لال ہونٹ سرخ آنکھیں، سانپ سی زلفیں، کالے تل اور دُنبالہ دار بھویں جان کی بیوا ہیں)

ٹ میری رائے میں "ادھر" ہونا چاہئے۔ ٹ دن، ہنوالی

یوں کرے بناتی سید علی　　تجھ سادہ پرم کی سدھ تلی
پک آؤ پیا جیو (ن) پاؤن ولی[1]

(سید علی اس طرح منت سماجت کرتا ہے اور تیری آرزو میں اپنی محبت سے بھی بے خبر ہوگیا ہے۔ اے محبوب ذرا آؤ کہ میں پھر زندہ ہو جاؤں)

اپنیں ایسی بوجھی سارو　　بوجھی تھی ان بوجھیا وارو

(ہماری ساری سمجھ ایسی ہے کہ سمجھ سے بے سمجھی بہتر ہے)۔

بوجھ پناں جے تمھوں دیا ہے　　رتی کا کور بھاگ کیا ہے
اُس منہ بھی اُن بھیس لیا ہے

(جو سمجھ کہ تمھیں دی گئی ہے وہ گویا کروڑ میں سے ایک رتی ہے اور پھر اس میں بھی اسی کا جلوہ ہے)۔

تم ری پیا کو دیکھو جیسا　　ھور جیوں پرتھو سائیں ایسا
سوی تہیں ہونا توہ ویسا

(تم پیا کو جیسا دیکھتے ہو یا جیسا سمجھتے ہو سو وہ تم ہو، وہ ویسا نہیں ہے۔ یعنی تم حق سبحانہ کو اپنے خیال میں جیسا دیکھتے یا سمجھتے ہو وہ تمہارا ہی خیال اور تصور ہے وہ ویسا نہیں ہے)۔

تن من سوں جیو دیکھیا جاوے　　بوجھ تمہارے ریتھنہ آوے
لوک اپاناں بھید نہ پاوے

(تن اور من جیسا تم دیکھتے ہو سو وہ تمہاری ہی سمجھ ہے، نادان لوگ بھید کو نہیں پہنچتے)

---

[1] بمعنی پھر

جب تم شہ منہ کھو کر جاؤ کے تم اپس ماہیں آؤ
دُنہ پر پیو کوں تمہیں نپاؤ
(جب تم اُس میں اپنے ہوش و حواس کھو دو یا تم اپنے آپے میں آجاؤ دونوں طرح بھی تم محبوب کو نہیں پاؤ گے)۔

سرگ اچھر ہور مندر ماری ہر جے اُسمند ندیاں باری
مانک موتی سکھ سنکارا اے سب بھیس پیا کا ساری
(آسمان اور ستارے اور مکان اور محل جن میں ندیا اور ہوائیں چلتی ہیں۔ موتی اور جواہرات، سنکھ اور سیپیاں یہ سب محبوب کے بھیس میں ہیں)۔

کبھیں سو ہوے اندھیاری راتا سانج بتی کرلاوے دھاتا
ہوکر دیوار راتیں ساری لا کر جوت دکھاوے بھاری
(جب کبھی اندھیری رات ہوتی ہے تو شام کو جلدی سے چراغ روشن کرلاتا ہے اور کبھی ساری رات چراغ بن کر خوب خوب روشنی کا سماں دکھاتا ہے)

مُکھ پر بال بکھیر سو ساتھی چھپ کر ہووے رات سنگھاتی
ولی سنبھال سو بکھرے کیسا دن ہو آوے سورج بھیسا
(مُکھ پر بال بکھیرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی چھپ کر رات کو رفیق بن جاتا ہے۔ پھر بکھرے بال سمیٹ کر سورج کے بھیس میں دن بن کر آجاتا ہے)۔

ایک سمندرہ سات کہاوے دھو نوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمند ہو بوند دکھاوے ندیاں نالے ہو کر جاوے
(سمندر ہے تو ایک مگر مشہور سات ہیں وہی بخار، بادل اور مینہ ہو کر آتا ہے، وہی

ایک قطرے میں نظر آتا ہے اور وہی ندی نالے ہو کر بہتا ہے)۔

کبہیں سو میہا ہو جھر لاوے　　　کبہین پیوتے اولے تھاوے
کاج بیج ہنس آپیں کہیلے　　　نار پرکھ ہو وہیسو جھیلے

(کبھی مینہ ہو کر برستا ہے اور کبھی اولے بن بن کر گرتا ہے، کبھی گرج اور بجلی بن کر ہنس ہنس کر خود کھیلتا ہے، اور کبھی عورت مرد بن کر پانی میں آپ ہی اپنے سے کھیلتا ہے)

اہنس اسہیں کا جین روؤں　　　جیوں تھی ویسو تیہو نہیں ہووں
(ہمیشہ اسی باعث روتی ہوں کہ جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب ہوں)

جے ہے سو ہیسو ہے جے نہیں نہیں　　　چھت ایک وہی ہے سو کہیں
(جو ہست ہے وہ ہست ہے اور نیست ہے۔ ایک ہی ذات ہے جہاں کہیں بھی ہو)۔

پیو ملا گل لاگ رہیجے　　　سکھ منہ دکھ کی بات نہ کیجے
(پیا ملے تو گلے لگ کے رہیے اور سکھ میں دکھ کی بات نہ کیجئے) کیا خوب کہا ہے۔

بُہ سکھ منہ جب ٹک دکھ آوے　　　دکھ بھی تب سکھ ہو کر جاوے
(یعنی بہت سے سکھ میں ذرا ذہور دکھ آجاتا ہے تو وہ بھی سکھ ہی ہو جاتا ہے)

ادرک مُنہ جب کھانڈ بھلائی　　　کیری مُنہ جب ساکر بھائی
شیرا حلوا کر کر کھائی　　　تب تو ساد انیری پائی

(جب ادرک میں کھانڈ ملائی اور کیری (انبیا یا آم) میں شکر ڈالی اور مٹھاس اور حلوا کر کے کھایا، تبھی تو نادر مزا پایا)۔

اس قدر نمونہ اس بات کے دکھانے کے لئے کافی ہے کہ دسویں صدی میں گجری کی اُردو کس قسم کی تھی۔

شاہ صاحب کا انتقال سنہ ۹۷۳ ہجری میں ہوا اور احمد آباد رائے کھیڑ میں مدفون ہوئے۔

یہ کتاب دیوان کے نام سے مشہور ہے۔ دیوان کے معنے یہاں مجموعہ کلام کے سمجھنے چاہئیں۔ مرتب نے اسے کئی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان ابواب میں کوئی خصوصیت نہیں اور نہ مضامین کی کوئی خاص تقسیم ہے۔ ایک آدھ باب کے ساتھ تو عنوان لکھا ہے ورنہ تقسیم صرف حروف تہجی کے نام سے کردی گئی ہے، یعنی باب الالف باب البا وغیرہ۔ حجم کے لحاظ سے بھی ابواب میں کوئی یکسانی نہیں۔

ہر باب کا پہلا شعر اُسی حرف سے شروع ہوتا ہے جس حرف پر اس کا نام ہے۔ مثلاً باب الالف کا شعر الف سے شروع کیا گیا ہے، اسی طرح باب التا کا "ت" اور باب الہا کا "ہ" سے۔ اس کے بعد ہر باب میں اشعار کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ شروع میں باب کے نام کے بعد "مکاشفہ نکتۂ اول در عقدہ" ہے۔ اس عنوان کے تحت میں صرف دو مصرعے ہیں، اس کے بعد نکتۂ دوم، نکتۂ سوم وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، کسی باب میں زیادہ کبھی کبھی چند نکتے لکھنے کے بعد پھر "مکاشفہ نکتۂ اول در عقدہ" لکھ کر اس کے تحت میں ایک شعر درج کر دیا گیا ہے۔ اور پھر نکتۂ دوم، نکتۂ سوم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعض ابواب میں یہ عمل کئی کئی بار ہوا ہے۔ نکتوں کے تحت کبھی تو دو مصرعے ہوتے ہیں، کبھی تین، کبھی چار اور کہیں کہیں چھ اور آٹھ بھی ہیں۔ مکاشفے اور نکتے میں کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔

میرا نسخہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے، جس میں عموماً قدیم دکنی زبان کی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ خط صاف اور اچھا ہے اور قلم بھی کسی قدر جلی ہے۔ د ڈ، ج چ، ک گ میں کچھ فرق نہیں کیا گیا۔

کل اوراق ۱۳۳ ہیں۔ ہر صفحے میں آٹھ دس سے زیادہ سطریں نہیں۔

آخر صفحے کے آخر حاشیے پر یہ عبارت درج ہے :۔

"........ بلدۂ برہان پور ہمراہ لشکر نواب نظام علی خاں بہادر نظام الدولہ بقیمت .... در سنہ ۱۱۸۸ ہجری نبوی برائے مطالعہ حصر .... از مہدی علی خاں پسر احسن اللہ خاں مرحوم ست" ـــــــ

افسوس ہے کہ کتابت کا سنہ کہیں درج نہیں ہے۔

(رسالہ "اُردو" جولائی ۲۸ء)

میاں شیخ خوب محمد چشتیؒ

اس سے قبل میں شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے حال اور کلام کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ اسی زبان کے ایک دوسرے مصنف شیخ خوب محمد چشتی بھی گزرے ہیں۔ یہ بھی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کا کلام وہیں کی مقامی زبان میں ہے جو گجری کہلاتی تھی۔ صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں کہ وہ "درویش کامل و صاحب لسان و صاحب سخن بودند و در تصوف دست رسا داشتہ"۔ اور اس پر ان کا کلام شاہد ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "خوب ترنگ" ہے۔ اسی کی شرح انھوں نے فارسی زبان میں لکھی ہے جس کا نام "امواج خوبی" ہے۔

میاں صاحب شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے، چناں چہ فرماتے ہیں:۔

وارث محمدی ہر ٹھانوں　　　شیخ کمال محمد نانوں

کیا عروج مقام اقدام　　　اللھم اغفر وارحم

پھر اگلے شعر میں ان کی تاریخ بیان کی ہے ——

کر تاریخ تنہوں کی خوب　　　جن عدد ذاکر محبوب

"ذاکر محبوب" سے ۹۷۹ ہجری نکلتے ہیں ——

یہ کتاب (خوب ترنگ) انھیں کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ خود کہتے ہیں:۔

ان کوں تھا یہ علم کمال　　　خذ العلم افواہ رجال

انتھیں میں سنیا دن رات اس میں یاد رہی کچھ بات
وہ جیوں مجھ کون آئی ترنگ جمع کئے ئی تس لتس ڈھنگ

کتاب کی زبان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

جیوں میری بولی منہ بات عرب عجم مل ایک سنگھات

اس کی شرح "امواج خوبی" میں یوں کی ہے۔ "ہرایک شعر بزبان خود تصنیف کردہ اند ومی کنند، من بزبان گجرات (گجراتی) کہ با الفاظ عربی وعجمی آمیز است گفتہ ام"۔ یعنی وہ اپنی زبان کو عربی عجمی آمیز گجراتی بتاتے ہیں۔ درحقیقت یہ اُردو کی ایک صورت ہے جو گجرات میں رائج تھی اور گجری کہلاتی تھی اور اسی کی بہن دکنی تھی جو اس کے پڑوس دکن میں بولی جاتی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ دونوں ایک ہی زبانیں ہیں صرف مقامی رنگ کی کہیں کہیں جھلک نظر آجاتی ہے۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولے بولی گجرات

یہاں بھی اپنی زبان کو گجراتی ہی کہا ہے۔ شرح میں اس کا ترجمہ ہندی کیا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ان کی زبان گجری اُردو تھی۔

یہ کتاب سنہ ۹۸۶ ہجری میں تصنیف ہوئی جیسا کہ خود کہتے ہیں:۔

نسخہ کی تاریخ اس تھانہ پائے عدد ہر مصرع مانہ
خوب محمد گنے بچار چودہ گھاٹ اوس برس ہزار

یعنی ہزار میں سے چودہ کم یعنی ۹۸۶ جیسا کہ پہلے شعر میں اشارہ کیا ہے۔ دوسرے شعر کے ہر مصرع سے بحساب ابجد یہی سنہ نکلتا ہے۔

سنہ کے ساتھ تاریخ اور دن بھی بتا دیا ہے ۔

دوجا چاند سو تھا شعبان دیس دوشنبہ کیا بیان

اور اس کتاب کی شرح "امواج خوبی" کی تکمیل کی تاریخ پورے ایک ہزار سنہ ہجری ہے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا جب شاہان گجرات پر زوال آچکا تھا، اُمرا خودسر تھے اور سارے ملک میں طوائف الملوکی کی شان نظر آتی تھی۔ اکبر نے اسی زمانے

میں گجرات کو فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا تھا۔

اس زمانے میں علمائے سو اور صوفیائے زور کا بھی بڑا زور تھا اور طرح طرح کی بدعتیں اور بے اعتدالیاں مروج ہوگئی تھیں، لیکن اسی گروہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو حق کی حمایت اور اعلان میں بے خوف کام کر رہے تھے۔

خوب ترنگ خالص تصوف کی کتاب ہے اس میں شروع سے لے کر آخر تک مسائل تصوف سے بحث کی گئی ہے۔ مسائل اس قسم کے ہیں:۔

مرتبہ لاتعین، حضرت وحدت، حضرت الہیت، مراتب وجود، مقدمۂ فاعل۔ مختار مرتبہ محمدیت، مرتبہ روح، دائرہ عشق، مرتبہ عبودیت، مرتبہ قلب، مرتبہ سلوک، شرط ذکر، مراقبہ درشغل علم، مراقبہ درشغل سمع، مرتبہ حیرت، مقامات معراج، مرتبہ نبوت، مرتبہ رسالت وغیرہ۔

لیکن یہ سب علمی بحثیں ہیں۔ شاہ علی محمد جیو کی کتاب 'جواہر اسرار اللہ' اس سے مختلف ہے۔ اس میں عشق و محبت کا رنگ ہے اور قلبی واردات کا ذکر ہے۔ خوب ترنگ ایک خشک کتاب ہے جس میں تصوف کی اصطلاحات میں تصوف کے مقامات کا بیان ہے وہ حال ہے اور یہ قال ہے۔ علاوہ اس کے شاہ علی محمد جیو کے کلام میں جو گرمی اور حلاوت ہے وہ اس میں نہیں۔ شاہ علی جیو شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں اور اس میں عشق و محبت کی آگ ہے۔ میاں خوب محمد عالم اور سالک ہیں، تصوف کے نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ بڑے بڑے مسائل چند لفظوں میں نہایت اختصار سے بیان کر دیتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ انھیں خود ہی شرح لکھنی پڑی۔ ذیل کے نمونے سے ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو جائے گا۔

ابتدا (در حمد)

بسم اللہ کہوں چھت[۱] ذات ۔۔۔ جس رحمٰن رحیم صفات
ذات صفات اسما افعال ۔۔۔ جمع مفصل چند اک حال
نانو محمد تس کون دیت ۔۔۔ اوس تفصیل سو عالم کیت

[۱] ہستی

اوسی روح ارواح تمام | اوسی جوس کے سب اجسام
سارے ننھے منہ یہ بات | نیں کہوں گا بجت سنگھات
بجت ٹے سو اس تیں سمجھے جلے | جے حضرات سو خس کھائے
جوں کھلیا سمند چھپا رے | جانے سب دریا لے جاے

(جس طرح ماہی گیر پرندہ اس زور سے سمندر میں ڈبکی مارتا ہے کہ گویا سارے سمندر کو لے اڑے گا)

نوک ننھیں دریا بن پار | بھری تو نوک کی مقدار

(اس کی نوک تو اتنی ننھی سی اور دریا بے پایاں، تو سوائے اس کے کہ نوک کی مقدار بھر پانی لے اور کیا کرسکتا ہے)۔

جیوں ظاہر بھنتیاں کہلائیں | پن اینٹاں اس بھانت دکھائیں

(ظاہر میں دیواریں کہلاتی ہیں لیکن اصل میں اینٹیں ہیں جو دیوار نظر آتی ہیں)۔

ذرے مل اک ڈولا ٹھانہ | ناتوں دھرے یا ہے اینٹ سو تانہ

(اور یہ ذروں کا ایک انبار ہے جس کا نام اینٹ رکھ لیا گیا ہے)۔

جوہر عرض سو ذرا جان | تلتل پھرے عرض من آن

(ذرہ عبارت ہے عرض و جوہر سے اور عرض کو ایک لمحہ قرار نہیں)۔

جس کو وہم کرے نہیں دوے | ڈاوا جناں جسے نہ ہوے

(اور جوہر جز لایجزیٰ ہے کہ جس کی تقسیم ہو ہی نہیں سکتی اور نہ جس کا کوئی دایاں بایاں ہے)۔

پانیں پرب بھرے جیوں ہوے | پانیں اس منہ پئے جو کوے

(جیسے پیاؤ میں پانی بھر رکھا ہوتا ہے اور رہ چلتے اس سے مستفید ہوتے ہیں)۔

اس کا ہوے ثواب تس | جن پانیں بھریا اس مس

(اس کا ثواب اسے ہوگا جس نے پانی بھر کر رکھا ہے)

عالم حق کے پرب سو جیون | علم بھریا جیو پانیں پیون

۱؎ جثہ، جسم ۲؎ تفصیل

(اہل علم بھی حق کی سبیل ہیں اور علم پانی کی طرح ان میں بھرا ہے)۔

اوس سیکھیں بجے ہوے ثواب   سوے ثواب سو ذات کے باب

(اور اس کے سیکھنے میں ثواب اس کو ملے گا جس نے علم بھرا)۔

جسے ثواب اسیچ عذاب   اوسیچ لذت سمجھ شتاب

(پس جس کسی کو ثواب ہے اسے محنت و عذاب بھی ہے اور لذت اسی کو ہے جس میں سمجھ ہے)۔

بھری طشت میں ماٹی جب   دوجی ماٹی مارے نہ تب

(جس وقت طشت کو مٹی سے بھر دیتے ہیں تو پھر اس میں دوسری مٹی نہیں سما سکتی)

پانیں جب ریڑو اس مانہ   پچھیں سمارے پانیں تانہ

(لیکن جب اس میں پانی ڈالتے ہیں تو پانی اس میں سما جاتا ہے)

جس بائیں پانی سوس جائے   پانی میں باؤ سماے

(جس طرح پانی مٹی میں مل گیا اسی طرح ہوا پانی میں سما جاتی ہے)

پچھیں سماوے آگ بسیکھ   پانی آگ تتا کر دیکھ

(اگر طشت کو آگ سے گرم کریں تو آگ سما جاتی ہے)

جے کو ہوے بہت لطیف   مارے لطیف سو مانجھ کثیف

(جو چیز کہ لطیف ہے اس کی گنجائش کثیف میں نکل آتی ہے)

خدا لطیف سو جس کا ناتوں   اہے محیط سو وے ہر ٹھانوں

(خدا لطیف ہے اور وہ ہر شے میں ساری ہے)۔

کلام کے اس مختصر نمونے سے ان کی شاعری اور زبان کی حالت معلوم ہوتی ہے — !

میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ گجری اُردو میں گجراتی کے لفظ ملے ہیں۔

چنانچہ اس زبان کے الفاظ شیخ علی جیو اور میاں خوب ترنگ کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

لفظ	معنے	لفظ	معنے
ہوں	میں	ہب یا ھبیں	اب
ڈوسی	بڑھیا	جمنا	دایاں
بکت	تفصیل	چھیلا (چھیلی)	آخری
اونڈا	گہرا	ٹونکا	مختصر، تھوڑا
مان	میں	ہپوٹے	حباب
چھولی	چھوٹی موج		

دکنی میں "ھی" کے لئے "چ" کا حرف آتا ہے اور گجری میں اسی معنی میں "ج" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً دکنی میں "اس ہی" کو "اسیچ" کہیں گے اور گجری میں "اسیج" اسی طرح ایکج اور ایکج وغیرہ۔

تحفۃ الکریم میں میاں خوب محمد کا سنہ وفات سنہ ۱۱۰۳ ہجری لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیوں کہ خوب ترنگ کا سنہ تصنیف سنہ ۹۸۶ ہجری اور شرح کی تکمیل کا سنہ ۱۰۰۰ ہجری ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ ان کی عمر اس قدر ہو۔ علاوہ اس کے ان کی تاریخ وفات "خوب تھے" سے نکلتی ہے جس کے عدد بحساب ابجد ۱۰۲۳ ہوتے ہیں اور یہی ان کا سنہ وفات ہے۔

میاں صاحب کا انتقال گجرات ہی میں ہوا اور ان کی قبر چوک احمد آباد متصل مسجد فرحت الملک دروازہ خارو میں ہے۔

(رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۲۹ء)

حسن شوقی

حسن شوقی عادل شاہی شعراء میں سے ہے اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۷ ہجری) کے عہد میں تھا۔ اس کا پتا اس بات سے لگتا ہے کہ اس نے ایک نظم "میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ" لکھی ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء میں سے تھا۔ چناں چہ ابن نشاطی نے اپنے قصۂ پھولبن کے آخر میں جہاں چند مشہور اور نامور دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے، وہاں حسن "شوقی" کا بھی نام لیا ہے ؎

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بھیجتا رحمت منج اپرال

پھولبن کا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ ہجری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا۔

علاوہ غزلیات کے مجھے حسن "شوقی" کی دو نظمیں ملی ہیں۔ ایک "فتح نامۂ نظام شاہ" یا "ظفر نامۂ نظام شاہ" اور دوسری "میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ"۔ فتح نامے یا ظفر نامے کے میرے پاس دو نسخے ہیں، جن میں سے ایک نسخہ ناقص ہے۔ ناقص نسخے کے آخر میں اشعار زائد ہیں۔ ان میں فتح کا سنہ بھی دیا ہے اور نظام شاہ کو بہت بہت دعائیں دی ہیں۔ جیسے کوئی زندہ شخص کو دعائیں دیتا ہے۔ مثلاً :-

سدا جیو راجے جنم راج کر بسے لگ دنیا نت نیا کاج کر
مبارک ظفر آسمانی اچھو تجے فتح نصرت سبحانی اچھو

یہ فتح سنہ ۹۷۲ ہجری میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس وقت شوقی زندہ نہیں تھا۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار الحاقی ہیں۔ اسی نسخے کے آخر شعر میں شاعر کا تخلص بھی ہے۔ دوسرے نسخے میں یہ شعر نہیں ہے۔

یہ جنگ جس کی فتح اس مثنوی میں منائی گئی ہے، تالی کوٹ کی مشہور لڑائی ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اس زمانے میں وجیانگر کی حکومت نہایت شان وشوکت کی تھی۔ رام راج نے تمام باغی راجاؤں کو مغلوب کر لیا تھا اور اس کی سلطنت کرشنا سے لے کر راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ گوداوری کے دہانے تک پہنچ گئی تھی۔ اور بہت سے راجا اس کے باج گزار تھے۔ اس وقت جنوب میں رام راج سے بڑھ کر کوئی طاقتور اور زبردست راجا نہ تھا اور اس کی دولت اور شان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر جو مسلمان حکومتیں اس کی جگہ قائم ہوئیں، ان کی باہمی نزاع سے وجیانگر کی قوت اور بڑھ گئی اور کرشنا اور تنگ بھدرا کا دوآبہ بھی ایک طرح سے رام راج ہی کے زیر اثر آ گیا ۔ اس قوت اور عروج کے گھمنڈ پر رام راج نے طرح طرح کی دست درازیاں شروع کیں۔ تالی کوٹ کی جنگ سے چند سال قبل رام راج نے عادل شاہ سے مل کر نظام شاہ کو سخت شکست دی اور اس کے سارے ملک کو تباہ و برباد کر دیا۔ نظام شاہ مجبور ہو کر اپنے دارالحکومت احمد نگر میں محصور ہو گیا۔ یہاں رام راج اور اس کے سرداروں نے بہت بدعنوانیاں کیں۔ مسجدیں توڑ ڈالیں، مشائخ قتل کر دیئے گئے، عورتوں کی آبروریزی کی اور اسی قسم کی شرمناک حرکتوں کے مرتکب ہوئے۔ مسلمان بادشاہ اس سے بہت برافروختہ ہوئے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ان بادشاہوں کو ناگوار خاطر تھی وہ رام راج کا غرور و تکبر تھا۔ وہ پہلے کی طرح کبھی ان سے خلوت میں نہ ملتا اور جب کبھی دربار میں بلاتا تو سیدھے منہ بات نہ کرتا اور دیر تک کھڑا رکھتا۔ سواری کے وقت انھیں ساتھ ساتھ پیدل چلاتا، جب اجازت دیتا تو سوار ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر اس پر لشکر کشی کی۔ رام راج کو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ اس نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان چھوکروں کو ایک ہی حملے میں پسپا کر دوں گا۔ اگرچہ بہت بڈھا تھا مگر خود میدان کارزار میں پہنچا۔ بڑی گھمسان کی

لڑائی ہوئی۔ مختصر یہ کہ رام راج اسی میدان میں مارا گیا اور وجیانگر کی پر شان و شکوہ سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

"شوقی" نے اس جنگ کا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نام "فتح نامۂ نظام شاہ" کیوں رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہ کو رام راج بہت ذلیل کر چکا تھا اور وہ انتقام کی فکر میں تھا۔ دوسرے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت دکھائی۔ قلب لشکر اسی کے زیر کمان تھا۔ جب ہندوؤں کی فوج نے یمین و یسار سے ایک شدید حملہ کیا تو مسلمان فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس سے علی عادل شاہ اور قطب شاہ پر مایوسی چھاگئی اور اُنھوں نے بھاگنے کی فکر کرنی شروع کی۔ مگر نظام شاہ قلب لشکر میں برابر جما رہا اور اس زور سے غنیم کے حملے کا جواب دیا کہ رام راج کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ شامتِ اعمال سے یہ دیکھ کر راجا تخت سے اُتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہو گیا کہ اتنے میں نظام شاہ کا ایک مست ہاتھی غلام علی نامی وہاں آ پہنچا اور آدمیوں کو پامال و ہلاک کرنے لگا۔ کہار (بھوئی) اس پریشانی میں سنگھاسن پٹک کر بھاگ نکلے۔ اتنے میں کہ راجا سنبھلے سنبھلے مسلمان فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور وہ اسے پکڑ کر نظام شاہی توپ خانے کے افسر رومی خان کے پاس لے گئے۔ رومی خاں نے نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ نظام شاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر کے نیزے کی نوک پر چڑھایا جائے اور مشتہر کیا جائے تاکہ غنیم کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے بھی فتح کا سہرا نظام شاہی کے سر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ "شوقی" نے اس فتح کو نظام شاہ سے منسوب کیا اور اپنی نظم کا نام "فتح نامۂ نظام شاہ" رکھا۔

شروع میں چند شعر حمد میں ہیں:۔

الٰہی کرم کا کرنہار توں ۔۔۔ ہے اول و آخر رہنہار توں

سو قادر ہے قائم تو پروردگار ۔۔۔ توں نادر ہے دائم اہیں برقرار

کیا ہور کرتا کرے گا سو ہوئی ۔۔۔ ترے باج ہرگز کرے گا کوئی

دو چار اور شعر لکھنے کے بعد دو شعر نعت میں ہیں اور اس کے بعد آغاز جنگ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا عنوان یہ ہے:۔

"شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ"

ابتدا میں شاعر بیان کرتا ہے کہ دُنیا میں کیسے کیسے شجاعت اور دولت او نام والے لوگ ہوئے ہیں، جن کی شہرت اور کارنامے اب تک یادگار ہیں۔ اور اس ضمن میں سکندر، نوشیرواں، جمشید، حمزہ، محمود غزنوی، رام چندر، کشن، ارجن، شداد، ہامان وغیرہ کے نام گناتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسان کی خوبی اس کے افعال سے ہے اور ہر ملک اور قوم میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔

سدا ہے سو بھر پور دریا کوں جل — شرف ہے سیپی کوں سو موتی بدل
شرف مرد کا ہے چلنت خوب خاص — جو پھولوں کی خوبی سون پھولوں کی باس
ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے — ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے

اس کے بعد ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں بیان کرتا ہے اور ملک دکن کو سب سے افضل ٹھہراتا ہے :-

خراساں کے شاہاں ہیں شمشیر بند
روہیلے پٹھاناں وگرزی کمند
عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور
دو رایل جیتے راج ہیں دزد چور
دو حکمت کرا ملک ہے روم و شام
طرف کربلا کے شہیداں تمام
دو ایران و توران ہور ملک سند
اہیں پر عقل باد شاہاں ہند
ہنر کا جیتا لوک ہے مغربی
دو جامع اہیں گنج کے مغربی
دو قبطی فراست میں ہیں زور ور
شمالی جیتے بے فہم گاؤ خر

سو افضل میانا ہے ملک دکن
ہوئے یاں کے شاہاں جتے خوش لکھن

اب دکن کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے:-

عادل شاہ لکھاویں علی کے غلام — نظام شاہ بحری لکھاویں نظام
عدل داد ہور دہش کو اگل[1] — کیا بادشاہی سو بازو کے بل
قطب شہ کے گھر میں سدا راجپوت[2] — بریدی تھے جبروی جیو کے گھٹ[3]

اس کے بعد آپس میں عہد و پیمان کرنے اور متحد ہو کر رام راج سے لڑنے کا ذکر کرتا ہے:-

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوے — محبت سوں اخلاص یک دل ہوے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق — اپس میں اپیں مل گئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا — جو اس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بھاگ سوگند و عہد استوار — یوں غازی غزا پر رہئے برقرار
بچو ڈر بلاتی جو شب درمیاں[4] — دیکھیں کیا چرخ پھیرے آسماں

اس کے بعد دوسرا عنوان یہ ہے:

"رائے اندیشیدن رامراج با وزیران خود برائے جنگ کردن بہ نظام شاہ"

اس کی ابتدا شاعر نے سورج کے ڈوبنے، رات کے آنے اور چاند کے نکلنے سے کی ہے اور اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے، یہ نظامی وغیرہ فارسی شعراء کی تقلید کی ہے لیکن ہندی الفاظ اور ہندی خیال کی آمیزش نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ یہاں چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں:-

دو محبوب نس[5] کی سنواری اپس — مرصع زر ینا نکاری[6] اپس
سو کو کم و کیسر جو اہور چندن — لیتے مشک کے اوٹنے چندر بدن

---

۱ بڑھا ہوا، سبقت لے جانے والا ۲ بادشاہی ۳ قومی۔
۴ "بترس از بلائے کہ شب درمیان است" کا ترجمہ ہے۔ ۵ رات ۶ نکھاری۔

کھولے بال سر کے سو کالے دراز — سنواری بیٹھے بیکھ اپنا سو سانہ
دہ موتی گگن کے تارے ہوئے — ودسیس[1] پھول سارے ستارے ہوئے

اس منظر کے بیان میں کوئی چوبیس شعر لکھے ہیں، آخری شعر یہ ہیں:-

ڈوبی قاب زرین سو غرقاب ہیں — گئی حور زنگی کرے[2] خواب ہیں
حبش نے پھولن چیر سر پر لیا — ترک دیکھ پر نار سر تل کیا
حبش تی جو پرگٹ ہوا چندروپ — حبش نے جنے ترک چینی سر دپ
بیٹھا کاک کالا اڈیا راج ہنس — اوٹھی سیام سندر سو تارلج اونس
پڑیا پھول پر جب بھنور پنکھ پسار — چھپا ترک زنگی کھڑا آشکار
بیٹھا[3] دھن اوپر آ دگر کال جو — موا سورتل چاند اوپرال جو

اس سمے میں رام راج تخت پر آکر بیٹھتا ہے اور دربار کرتا ہے:-

بیٹھا، رام تب آسیا سن[4] اوپر — مکٹ[5] مال گل[6] گھال[7] ابرمن اوپر[8]
سو ڈنڈ دت کیے آ دگر رائے سب — جتے رائے رایل پڑے پاے سب

اب وہ خلوت میں خاص خاص مصاحبوں اور ارکان سلطنت کو بلا کر مشورہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ نظام شاہ نے میرے دل میں گھاؤ ڈال دیئے ہیں، تمام دنیا میری حکومت کو مانتی اور مجھے خراج دیتی ہے۔ بڑے بڑے راجہ مجھے تحفے بھیجتے ہیں لیکن یہ ترک مجھے خاطر میں نہیں لاتا، نہ یہ دیو کو مانتا ہے نہ پری کو، خراج دینا تو درکنار، اور ڈراتا دھمکاتا ہے۔ آج چار دانگ عالم میں میرے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی کیا یہ حقیقت ہے۔ اب تم مجھے سوچ کر مشورہ دو کہ اس معاملے میں کیا کروں؟

کیا رام خلوت منے انجمن — بلایا جتے رائے اور رائے زن
چندر بھان ملتم و نیکٹا دھری[9] — جلن بہار سوں دھرتری تھرتھری

---

[1] سر [2] کے [3] مطلب یہ کہ خزانے پر کالا سانپ آ بیٹھا، یعنی اندھیرا ہوگیا۔ سورج غروب ہوگیا اور چاند طلوع ہوا [4] سنگھاسن، تخت [5] تاج [6] گلے کا ہار [7] ڈال کر [8] جواہرات، لباس فاخرہ [9] رام راج کے بھائی کا نام تھا۔

رتن جڑت جو کمی دھریا سامنے | کہا بیس[1] مجھ۔ آمنے سامنے
کیا رخت دولت کے تم تھانب[2] ہیں | تمیں مرد میدان کے رن کھانب[3] ہیں
تمیں پانچ تن ملکہ[4] یک بد کہو | تمیں پانچ جن ملکہ یک سو کہو
بھوت رن تی چھاتی منے سل[5] اہے | نظامیاں سو مجھے آج[6] سوندل اہے

اس کے بعد کا عنوان یہ ہے:

"رائے دادن وزیراں رام راج را درباب جنگ نظام شاہ"

سب وزیر اور مشیر یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ آج دنیا میں تیرا وہ زور ہے کہ کسی راجہ یا بادشاہ کی مجال نہیں کہ تیرے سامنے آنکھ اٹھا سکے۔ تو وہ شہ زور ہے کہ شیر اور سی مرغ تیرے آگے کبوتر کے بچے ہیں۔ نظام شاہ بچارے کی کیا حقیقت ہے۔

کہاں رام راجیا کہاں شاہ حسین
کہاں بحر قلزم کہاں فلتین

توں گرمی منے شاہ تی کم نہیں | توں سردی منے ماہ تی کم نہیں
اندھارے کوں توں دھوپ چھانوں | خرابی کو ڈونگر[7] بستی کو گانوں
وو گرمی کرے توں تو سردی سوں ٹال | وو سردی کرے توں تو گرمی سو جال[8]

یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ رائے دی کہ حسین شاہ کو لکھا جائے کہ وہ نقد و جواہر اسلحہ، عود عنبر اور ملک میدان (توپ) وغیرہ وغیرہ بطور خراج کے بھیجے۔ اس مشورے کے مطابق اب خط لکھنے اور بھیجنے کی تیاری ہوتی ہے۔

"نامہ نوشتن رام راج بہ نظام شاہ وطلب کردن بعضے اشیائے عجائب"

نامے کے شروع میں خدا کی حمد و ثنا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ کفر و اسلام میں کوئی فرق نہیں، سب میں اس کا جلوہ ہے اور انسان انسان سب ایک ہیں۔

توں شداد ھور عاد نمرود کوں | جدا کر کہ بوجے توں معبود سوں

---

[1] بیٹھ [2] تھم، ستون [3] کھم، ستون یعنی جنگ کے ستون [4] ملکر [5] کرب بے چینی
[6] جگ [7] چٹان [8] جلا

اگر فیل و مور اژدر و بق اسے ہر یک شے منے مظہر حق اسے
تو کرتا ہے انکار کفار سوں نہ کفار سوں بلکہ کرتار سوں
اسے کفر و اسلام کرتار کا جو جینے ہیں تھا گا سو زنار کا
دلے جو ہوا سو موحد ہوا موحد ہوا نین سو ملحد ہوا
کہے شیخ سعدی نے عالم کو پند بنی آدم اعضائے یک دیگرند

پھر ہدایت کی ہے کہ تو گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دے۔ مکے کی جگہ تو رتل کو سمجھ اور عرب کی بجائے جنگموں کی پرستش کر۔ یلورا اور دولت آباد کی حفاظت کر۔

قوی کر یا ورے کی بنیاد کون جو خجلت اچھے قصر شداد کون
نہ کم مان دے دولت آباد کون نہ سر پار کو دیکھ شمشاد کون

غرض اس قسم کی نصیحتیں کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میرے خراج کو خدا کی زکات سمجھ اور یہ چیزیں فوراً بھیج دے۔ اس میں گھنے۔ زیور۔ جواہرات، ہتھیار، طوائفیں، رنڈیاں، ڈومنیاں، سلطان فیروز کی زبرجد کی صراحی اور یاقوت کا پیالہ، دنیا بھر کی چیزیں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ یہ خراج تو نے مجھے بھیج دیا تو اس کے صلے میں تجھے احمد نگر بخش دوں گا۔ خط کے آخر میں فخریہ اشعار ہیں۔ جن میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر تعمیل نہ کی تو نظام شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

نہ ترکان کون چھوڑوں نہ ترکی کمان اگر گیو رستم ہو، حاضر منمان
نہ چھوڑوں ملا تا نہ چھوڑوں فقیر نہ بڑکا نہ لڑکا نہ برنا نہ پیر
اوک دور بنیاد اسلام کی جو مانے در اہی جگت رام کی

یہ خط لے کر ہری داس ایلچی نظام شاہ کے ہاں پہنچا۔ بادشاہ خط پڑھ کر مسکرایا اور مشورت کے لئے وزیروں کو طلب کیا۔

؎ طلب کردن نظام شاہ وزیران خود را و بایشاں مشورت کردن ؎

شروع میں چند اشعار سورج کے ڈوبنے اور چاند کے نکلنے پر ہیں۔ شب میں

---

[1] آقائی

بادشاہ کا دربار ہوتا ہے اور اس دربار کا ٹھاٹ بیان کیا ہے۔ جب سب امیر وزیر جمع ہوگئے تو نام لے کے سب کو مخاطب کیا اور رام راج کا خط سُنایا اور نہایت جوش اور غصّہ سے اس کے تمرد اور جبر و تعدی اسلام کی بے حرمتی اور مسجدوں کے انہدام کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک اس مردود کا سر قلم نہ کردوں۔

نہ مج آس دھن دین کی ریس ہے
مرا کھرک[1] اور رام کا سیس[2] ہے

"جواب دادن وزیران نظام شاہ را درباب فکر رام راج"

وزیروں نے جواب دیا:۔

نکو فکر کچھ رام کے کام کی — نہ اس رام کی بل ہریرام کی
تجھے فوج سد سکندر اہے — اتا قا سو جبرئیل کا پرا ہے
تجھے چرخ بازو کھرک برق ہے — اسے سنگ خارا اگر فرق ہے

غرض اس طرح نظام شاہ کی تعریف اور رام راج کی مذمت ہے

"نامہ نوشتن نظام شاہ بر رام راج در جواب او"

دبیر شاہی کو جواب لکھنے کا ارشاد ہوا اور اس نے حمد و ثنا سے نامہ شروع کیا۔ پھر بہت سے مقدس بزرگوں، مقدس کتابوں اور چیزوں کی قسمیں کھا کر رام راج کو ہدایت کی ہے۔

نہ پتیار[3] کچھ زور کے تین — نہ کہ راکھ وزن ترازو کے تین
نہ کر کچھ بھروسا کر آپار[4] مال — گھنا مال جس تس گھنا گوشمال
بتی جال ناجال فانوس کون — نگہ راکھ تون اپنے ناموس کون

یعنی اپنے زور بازو پر گھمنڈ نہ کرو اور ترازو کے وزن کا دھیان رکھو۔ اپنے بے شمار مال و دولت پر بھروسا نہ کرو، کیوں کہ جس کے پاس دولت زیادہ ہے اسے مصیبتیں بھی

---

[1] تلوار [2] سر [3] گھمنڈ کرنا [4] بے شمار

زیادہ بھگتنی پڑتی ہیں۔ بتی جلاتے جلاتے فانوس نہ جلا دینا اور اپنی عزت آبرو کا خیال رکھو۔ آخر میں دھمکی دی ہے:۔

سو مشعل جلاؤں سرانديپ پر | اوجالا کروں سب سنگل دیپ پر
وسا سیر کا سیر[1] جا بوکچا | کہ سی مرغ مجھ کن[2] کبوتر بچا

قاصد یہ خط لے کر رام راج کی طرف روانہ ہوا

"قاصد فرستادن رام راج بار دیگر بعد از شنیدن نامۂ نظام شاہ"

رام راج نے جل کر جواب دیا اور اپنے خط میں خوب چرکے دیئے ہیں، آخر میں کہتا ہے کہ اگرچہ تو شاہ بن شاہ بن شاہ ہے اور گو عاد (عماد الملک) تیرا پیشوا ہے اور اگرچہ تو نے خاندیس پر اپنی دھاک بٹھائی اور گونڈوانے سے خراج لیا، بہادر (بہادر شاہ) کو تو نے زیر کیا اور ہمایوں سے بڑی بہادری سے لڑا اور فرنگیوں کو بھگایا اور ملک کو اس شجاعت سے فتح کیا کہ سلطان روم نے بھی آفریں کی، مگر رام .... (راج) کچھ اور ہی چیز ہے۔

سبھی جگ ملے رام ان میل ہے | ملے موم آتش کنے تیل ہے
اگر شاہ کاؤس یا کیقباد | تو ہیں رام فرعون و شداد و عاد

... ...

اگر نور و وادی ایمن ہے شاہ | وگر سور نوروز بہمن ہے شاہ
کم اندیش ہے چار دہ سال کا | پر دہال دھرنا ولے بالکا
سو میں رام دھال کون اصل ہوں | سو شداد بن عاد کی نسل ہوں
نہ میں رام بل رام لکھمن ہوں میں | جو یک من ہے بھیری[3] تو دشمن ہوں میں
یہی بول قاصد روانہ کیا | وو آشہ نزیک[4] ماجرا سب کہیا

"سوار شدن نظام شاہ برائے جنگ رام راج"

اس میں فوج کی تیاری اور روانگی کا سماں دکھایا ہے۔ غرض نظام شاہ اپنی فوج لے کر کوچ پر کوچ کرتا ہوا میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

---

[1] سر [2] نزدیک [3] یعنی نظام شاہ بحری [4] نزدیک

ہوا گرم تر معز تب راے کا
سُنا جب یو آواز کرنا ئے کا

(مستعد شدہ آمدن رام راج برائے جنگ نظام شاہ)

رام راج نے نظام شاہ کے کوچ کی خبر سُنی تو اس نے بھی اپنی فوج کی تیاری کا حکم دیا اور فرمایا۔

کہ ہیں رام اپچھتے[1] ترک زور کیا
سمندر اپچھے حوض کوں شور کیا

مختلف فوجوں کی تیاری اور روانگی کا حال کسی قدر تفصیل اور شان سے بیان کیا ہے۔ آخری شعر یہ ہے۔

خبر گرم تر ہو (ن) بہر گوش میں (ن) ہوئی ہو
کہ دریا ے (ن) لنکھا ہوا جوش میں (ن) طوفان آتش

(فتح یافتن نظام شاہ بر لشکر رام راج وسر اورا بریدہ پیش تفال خاں فرستادن)

لڑائی بڑے زور شور سے ہوتی ہے لیکن شاعر شروع ہی سے حسین شاہ کے غلبہ کو بتاتا ہے۔ چناں چہ ابتدا ہی میں یہ شعر ہیں:۔

کلپ[2] جو کلنگان کے وو دیکھ عین چلیا فوج لے خ باند بھیری حسین
چلیا دل کھندل جون گرج گھن جیتا دندی بھول اوسان گئے لٹ پٹ[3]

غرض یہ کہ ــــ

خلل تھا کفر کا دیا جیں خدا کیا رام کا سیس تن سے جدا

وجیا نگر شہر لوٹا گیا، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور بادشاہ نے نماز پڑھی اور خدا کی درگاہ میں شکر ادا کیا۔

اس نظام کا جو ناقص نسخہ میرے پاس ہے اس میں فتح اور غنیمت کا حال ذرا بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور نظام شاہ بحری کی خوب دل کھول کے تعریف کی ہے اور آخر میں

---

[1] ہونے ہوئے [2] منصوبہ [3] فوجوں کو بادلوں کی گرج کی طرح روندتا ہوا چلا اور دشمن کے اوسان خطا اور پریشان ہو گئے۔

بہت سی روایتیں ایسی دی ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاعر اس وقت موجود تھا۔ فتح کا سنہ اور اپنا تخلص بھی دیا ہے۔ نیز شہر بیجانگر کی رونق، اور دولت اور اس کی شان وشوکت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ چیزیں مکمل نسخے میں نہیں ہیں۔

اگرچہ واقعہ شاعرانہ پیرائے میں لکھا گیا ہے، تاہم اس سے بعض تاریخی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً نظام شاہ اور رام راج میں جو خط وکتابت ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ فرضی ہے لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے خیالات ایک دوسرے کے متعلق کیا تھے اور وہ ان کی کن کن چیزوں کو ناپسند کرتے تھے ۔۔۔ اسی طرح بعض ناموں کی تصدیق اور تصحیح ہو جاتی ہے۔ چناں چہ اس لڑائی میں بعض سردار شریک تھے ان کے نام آگئے ہیں۔ غرض یہ مثنوی علاوہ شاعرانہ حیثیت کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے میرا ارادہ ہے کہ فرہنگ کے ساتھ پوری مثنوی شائع کردوں۔ اس میں بہت سے غیر مانوس اور اجنبی لفظ آئے ہیں، جن کا سُراغ لگانا اس لئے اور دشوار ہوگیا ہے کہ اصل سے بگڑ کر کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں۔

(۲)

"میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ"

یہاں مثنوی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے "فتح نامۂ نظام شاہ" ہے۔ اس میں جو نظام شاہ کی تعریف اور شان وشوکت دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "شوقی" کا تعلق نظام شاہیوں سے ضرور رہا ہے۔ اگرچہ مثنوی کی ابتدا میں عادل شاہ، قطب شاہ اور برید شاہ کا نام لیا ہے، لیکن دوران جنگ اور اثنائے فتح میں کسی کا کہیں ذکر نہیں ۔۔ یعنی جو کچھ کیا نظام شاہ نے اور فتح کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ گو تاریخی لحاظ سے بھی یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس سے "شوقی" کی طرفداری صاف ظاہر ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلے نظام شاہی دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہوگیا اور وہ عادل شاہی دربار میں آگیا۔ نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ سلطان محمد عادل شاہ ہی کے زمانے میں ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا الزام عادل شاہی حکومت پر ہے۔ کہ اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے اس حکومت کا

خاتمہ کر دیا اور سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس تباہی کے بعد "شوقی" دربار عادل شاہی میں آ گیا ہو۔

اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کا حال ہے۔ اگرچہ کسی تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس مثنوی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی ایک شادی مصطفےٰ خاں کی لڑکی سے بھی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ خاں محمد عادل شاہ کا وزیر اعظم اور سلطنت کے بڑے امراء میں سے تھا اور اس نے بڑے بڑے کارنمایاں کئے تھے، بلکہ ایک مدت تک سلطنت کے سیاہ وسفید کا مالک رہا۔ اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی، سلطان کی شہر گشت مصطفیٰ خاں کی مہمانی اور بیٹی کے جہیز کا ذکر ہے۔ یہ چند باتیں بھی زیادہ تر مثنوی کے مختلف عنوانات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مثنوی میں جشنوں کی دھوم دھام، میزبانی اور مہمانی کی شان و شوکت، عیش وعشرت کے سامان کا تو بہت کچھ ذکر ہے مگر اصل واقعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے اور اس کے بعد بادشاہ کی تعریف سے ہوتا ہے۔ حمد میں بھی صرف ایک مصرع ہے اور اس کے بعد ہی بادشاہ کی مدح شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے شعر یہ ہیں:-

اول یاد کر پاک پروردگار	پچھیں شاد کر شاہ عالی تبار
نبی کا خلیفہ خدا کا خلیل	با الہام و ہاتف نہ با جبرئیل
دم اندر جو عیسی مریم تمام	تکلم میں موسیٰ علیہ السلام
شجاعت میں رستم تی کچھ کم نہیں	سخاوت میں ایسا جو حاتم نہیں
سر سر فرازان بندے نواز	سو گردن فرازاں میں گردن فراز
سو سلطان محمد عدالت پناہ	کہیں خلق جس حکومت دستگاہ
خداوند تعالیٰ کی وہ چھانوں ہے	عرب ہور عجم میں جسے ناوں ہے
کرے عیش و عشرت جو آماں سنگات	ونلے مشورت پیر داناں سنگات
بڑا گیان ونتا رتن پارکھے	رتن پارکھے ہور بچن پارکھے

سو میٹھی شہر یار کی بات ہے — سو اس بات کی وحات نابات ہے
اگر شہ ساوے مجھے بول کر — تو نابات کوں میں سٹوں[1] بول کر
چو من کیست یارے دریں بوستاں — کہیں جس کی طوطی بہندوستاں

اس کے بعد وہ شادی کا ذکر چھیڑتا ہے:۔

سنیا میں کہ شہ گھر بڑا کاج ہے — کہ جس کاج کا خلق محتاج ہے
جہاں دار نے میز بانی کریا — اسے نانوں میں شادمانی کریا

اس کے آگے میز بانی کے سازو سامان، مکانات کی آرائش اور انتظامات کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ شروع اس طرح کیا ہے:۔

صفا دار صوفے و منڈپے بلند — بچھے شہ نشیں پادشاہاں پسند
بشنگرف سرخ و بزرنیخ زرد — برزحل و زرزنگار[1] و بالا جورد
صفا دار صوفے رنگارنگ ہوے — نمودار جاے کہ از رنگ ہوے
ٹکٹ لال سوں کاخ ماڑیاں مڑی — سو زرباف سوں باغ ماڑیاں مڑی

اسی طرح ہر چیز اور سامان کا ذکر کرتا چلا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی "صوفے" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ انگریزی میں یہ عربی لفظ "صفہ" سے پہنچا ہے۔ فارسی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

دوسرا عنوان یہ ہے:۔

(مجلس آراستن و بخشش کردن سلطان محمد مرداں را در میزبانی خود)

بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہیں اور امراء، وزراء مجرا و آداب عرض کرتے ہیں:۔

بیٹھا تخت پر آ و جمشید سا — زر افشاں کیا دست خورشید سا
سلحدار سردار جیتے وزیر — نہ گھر میں رہیا کوئی برنا و پیر
جیتے سرفرازاں جو درگاہ کے — جیتے محرماں خاص خرگاہ کے

---

[1] بھینگ حدول ۲ (ن) یہ لفظ غالباً "زنگار" ہوگا۔ زرنگار سے مصرع غلط ہو جاتا ہے۔

سو سر بھویں دھرے شاہ عالم کے تیں | رہے دیکھ کر ماہ عالم کے تیں
کتے سیس کے پائے لشکر کشاں | سو کر جوڑ ٹھارے رہے سر کشاں

اس کے بعد بادشاہ انھیں بیش بہا خلعت اور انعام واکرام عطا فرماتے ہیں۔ شاعر ہی انعام واکرام کی تفصیل بیان کرتا ہے، جس میں نفیس نفیس کپڑے، ہاتھی، گھوڑے، جواہرات، عطریات، سب کا ذکر آجاتا ہے۔ پانوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

شوقی رام راج کی شان وشوکت نہیں بھولا، چناں چہ کہتا ہے:-

پتا خرچ پاناں ہوا راج کاج | نہ سونے میں دیکھا کبھی رام راج

مختلف قسم اور مختلف مقامات کے پانوں کے نام لیتا ہے اور طرح طرح کی تشبیہیں دے کر بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ اور خاتمے پر کہتا ہے۔

کیتا کوئی کھائے کیتا کوئی لے جائے | مچھر کو ہتے[1] ہور مکھی کو ٹکائے[2]
کئے شکر یک بار عالم تمام | محمد نبی پر درود و سلام

تیسرا عنواں یہ ہے:-

(در بیان شہر گشت سوار سلطان محمد عادل شاہ)

شہر گشت کا بیان بہت خوبی سے لکھا ہے شروع یوں ہوتا ہے:-

سدا دار پر تجھ منگل[3] گرد گرد ہیں | منگل گرد گرد ین جیون بدل[4] گرد گرد ہیں
ہتی مست پر پیلباں مست ہے | زبردست پر کیا زبر دست ہے
سدا دار پر تج طبل باجتے | طبل باجتے ہور مندل[5] کاجتے
بہت دیس تی شہ کے گھر کاج ہے | شہر گشت کی رات سو آج ہے
شہر گشت کا ساز و ساماں ہوا | نفیریاں ترائے دماماں ہوا

اس کے بعد جلوس کا حال اور اس کی شان وشوکت ہے۔ بادشاہ کی سواری، طرح طرح کے باجے گاجے، ناچ رنگ، آتش بازی، روشنی، غرض ہر چیز کو بہت اچھی

---

[1] مارے [2] ڈرائے [3] بلجے [4] بادل [5] باجہ

طرح بیان کیا ہے۔ چند شعر ناچ کے متعلق دیکھئے، ناچنے والیوں کے انداز کس خوبی سے ادا کئے ہیں:۔

ہر کنیاں و کنچنیاں بہوت سازسوں / بجاویں دگاویں بہوت سازسوں

خوشی خرمی یں او بلتیاں چلیاں / اگھرتیاں و پھرتیاں او چھلتیاں چلیاں

سہیلیاں سہیلیاں میں جملتیاں دتیاں / ٹنگلیاں ٹھمکیاں وڈلتیاں وتیاں

آتش بازی کے بیان میں ایک شعر ہے:۔

ہوایاں ننھیاں وا تھیاں ناگنیاں / ہوا کے اوپر جا سنپولے جنیاں

ہوائیوں کو ناگنوں سے بہت اچھی تشبیہ دی ہے۔ یعنی وہ ہوائیاں نہ تھیں بلکہ ناگنیں تھیں اور اوپر ہوا میں جاکر جو چھٹیں اور ان سے پھول گرے تو وہ پھول نہ تھے، بلکہ سنپولے تھے جو انھوں نے جنے۔

تیسرا عنوان یہ ہے:۔

(در بیان مہمانی کردن نواب مصطفیٰ خاں سلطان محمد عادل شاہ را و دادن جہیز دختر)

صبح ہوتی ہے:۔

بیٹھا سورج جب نور کا تاج کر / بیٹھی رات کوہ قاف میں لاج کر

مصطفیٰ خاں کی مہمانی

سلیمان کو آصف نے مہماں کیا / عجائب غرائب بہوت کچھ دیا

سلطان کو اپنی بیٹی دیتا ہے یعنی چاند کو سورج کے حوالے کرتا ہے:۔

دیا چاند کوں سور کے سات کر / دیا نور کوں نور کے سات کر

اس کے بعد جہیز کا ذکر ہے۔ پھر مجلس کے ناچ رنگ کا ذکر دل کھول کے کیا ہے اور شاعری کی داد دی ہے۔ گانے اور ناچنے والیوں کا سراپا، ان کے ناز و انداز اور ناچ کا سماں خوب لکھا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد عادل شاہ کے سامنے دسترخوان بچھتا ہے جس پر طرح طرح کے نفیس کھانے سونے چاندی کے باسنوں میں چنے جاتے ہیں، ان کی

تفصیل بھی پڑھنے کے قابل ہے، جس سے اس وقت کے کھانوں کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں دعا پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔

دعائیہ اشعار یہ ہیں :-

قلم (دگر) گروں راس سب بانس کے — سیاہی دریا، کاغذ آکاس کے
لکھئے ہور لکھے بھرے یو تمام — صف شہ کی پوری نہوے والسلام
تو بہتر کہ "شوقی" زراہ صواب — دعا وو کرے جو اچھے مستجاب
سدا جیو راجے جنم راج کر — جو دشمن مونڈی تل کرے لاج کر
کرے راج جو لگ لگن دھرتری — کرے راج جو لگ پرب استری
شہر یار خاطر کے تیں شاد دار — قیامت لگوں یو رہوے یادگار

غزلیں

مجھے شوقی کی کچھ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن سے اس کی شاعری اور جوہر کھلتے ہیں۔ ایک غزل اس نے مسلسل لکھی ہے، جس میں شروع سے آخر تک "نین" اور "سوکا" کی تعریف ہے اور ان کو اس نے نئی نئی اور طرح طرح کی تشبیہوں سے مرصع کیا ہے۔ "سوکا" سُرمے کا وہ خط ہے جو عورتیں آنکھ سے لے کر زلف تک کھینچتی ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا سنگار سمجھا جاتا تھا۔ اس غزل کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں :-

دل بر سلونے نین پر کھینچی ہے سوکا خوب تر
خطاط جیون ماریا رقم جھندوں ثلث کے صاد پر
یا چک دوات ہے سیم کی لیکی سو بھر سیاہی رکھے
سو کا قلم جیون واستی کاتب گیا اس میں بسر
یا نین موتی ڈھال ہیں سوکا سو تاگا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تو رہیا ہے ٹوٹ کر

تجھ زلف ہے جیون ناگنی سو کا بچا نیکا جنی
مت کھاے کیس وہ پا پنی اسنیں چھپا نرگس بہتر
یا نین بازیگر اہیں تجھ حسن کے بازار میں
سو کا سلائی سحر کی بھایا[1] اس اپنے آنکھ[2] بہتر
یا ترنگ اچپل نین ہو سار سو ہندو برن
سو کالے برچھا نین دھر آیا کسی جیو مار کر
آہو کو بیٹھیا تیر یا کہہ ہیں کنجن چار یا لیا
یا تل زنگی کون مارنے لو چھن[3] نرک کینچیا[4] خنجر
یا پھول ہے گل لالہ کی سو کا ڈنڈی اس پھول کر
پتلیاں مرتب یوں دیسے جیون پھول پہ بیٹے[5] زنبور

ایک پوری غزل میں تجنیس لفظی سے کام لیا ہے۔ ہماری شاعری میں اس قسم کی صنائع کا شوق ہر زمانے میں رہا ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:۔

کھُب کھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب[1]
مج جیو کے گلے میں پڑیا ہے طوق غب غب
تپ تپ ہوا ہوں تب سین تیرے وصال کارن
جپ جپ کیا ہوں جپنا ہر دم کتا ہوں[5] اب اب
تج وصل کون درنگ ہے ہو مج نہیں صبوری
جاتی ہے زندگانی آتی ہے موت دب دب[6]
سروے قدان سوں ہاوے[7] شوقی ہوا ہے مجنوں
کب کب کیا ہوں توبہ کب کب گیا ہوں کب کب

[1] ڈالا [2] آنکھ [3] کھینچا۔ [4] خم [5] کہتا ہوں
[6] آہستہ آہستہ [7] دردِ فراق ۱۲

ایک اور غزل کا مطلع اور مقطع لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں :-

تجھ نین کا ماتا ہے جو اس جام سیتی کام گیا
تجھ زلف کا کافر اُسے اسلام سیتی کام گیا
شوقی نہ دکلا طبع کچھ .... فردوس کی
سنا جو کرتا ہے اسے انعام سیتی کام گیا

(رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۹ء)

له دردِ فراق

قاضی محمود دریائی قدس سرہٗ

قاضی محمودؒ بیر پور علاقہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کے باپ اور دادا اولیائے کرام میں سے تھے۔ والد قاضی حمید عرف شاہ چالندہ حضرت عالم کے مرید تھے اور دادا قاضی محمد حضرت قطب العالم سید برہان الدین سے ارادت رکھتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ قاضی محمود بچپن کے زمانے میں ایک بار اپنے والد کے ساتھ حضرت شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے لڑکے کو دیکھ کر فرمایا کہ "قاضی شملہ دراز دارد" یہ گویا اشارہ تھا اس بات کا کہ بڑا ہو کر یہ دنیا میں نام کرے گا اور اعلا رتبہ کو پہنچے گا اور ایسا ہی ہوا۔

قاضی صاحب نے علم باطنی اپنے والد سے حاصل کیا اور انہیں سے بیعت کی جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے:۔

قاضی محمد تن پیر ہمارا بہنوی محمود داس تمہارا
شاہ چالندھا پیاں لاکھ مناؤں یہ دکھ بھان ہمارا

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

قاضی محمد تن پیر سمرت چالندھا کے لاکھوں پاے

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

قاضی محمد تن پیر مناؤں
شاہ چالندھا کے سیوٹ سکھ پاؤں
قاضی محمد تن چالندھا میرا
بہت بھروسہ ہے مجھو تیرا

صاحب تحفۃ الکرام نے اس بیعت کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ وفات سے ایک روز قبل تمام اُمیدواران بیعت اور اپنے بیٹے قاضی محمود اور ان کے بیٹے کو بُلا بھیجا۔ پہلے قاضی صاحب کے بیٹے کو مرید کیا اور بعدازاں دوسرے لوگوں کو۔ سب سے آخر میں قاضی صاحب کو بیعت کی عزت بخشی اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ والد کی وفات کے بعد قاضی محمود ان کے جانشین ہوئے اور دم آخر تک خدمت خلق میں مشغول رہے۔

"دریائی" کا لقب ان کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عالم آب کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی اور جب لوگوں کی کشتیاں تلاطم میں آجاتیں اور تباہی کا خطرہ ہوتا تو وہ قاضی صاحب کی دُہائی دیتے اور ساحل مُراد پر پہنچ جاتے۔

قاضی صاحب نے اوائل عمر میں بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور آبادی سے دور جنگلوں میں بسر کی۔ بعدازاں احمد آباد میں چلے آئے۔ لیکن پھر سنہ ۹۲۰ ہجری میں اپنے وطن مالوف بیر پور چلے گئے۔ اور ۷۰ سال کی عمر میں سنہ ۹۴۱ ہجری (سنہ ۱۵۳۴ع) میں انتقال فرمایا۔ اس حساب سے ان کی ولادت کا سنہ ۸۷۴ ہجری (سنہ ۱۴۶۹ع) ہوتا ہے۔

قاضی صاحب سماع کے بہت دل دادہ تھے۔ ان کا کلام اچھا خاصا ضخیم ہے اس سے بھی موسیقیت کا ذوق ظاہر ہوتا ہے۔ ہر نظم خاص خاص راگنیوں میں ہے۔ ان کے کلام میں اُردو کی بالکل ابتدائی صورت نظر آتی ہے۔ یہ اس ہندی میں ہے جو شاہی فوجیں اور افسر اور مختلف پیشہ ور اپنے ساتھ دارالسلطنت سے مختلف صوبوں اور علاقوں میں لے گئے۔ اُردو رفتہ رفتہ اسی طرح بنی ہے جیسے کہ ہر زبان بنتی ہے، لیکن اس کے بننے کی شان بالکل جدا تھی۔ پہلے یہ ہوا کہ مروجہ دیسی زبان فارسی حروف میں لکھی جانے لگی، اسی کے ساتھ دیس والوں نے فارسی عربی لفظ بعض ضرورۃً اور بعض شوقیہ اس میں داخل

کرنے شروع کئے۔ بعد ازاں شاعر اس میں نظمیں کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے تحریریں کرنے لگی پہلے نظم اور بعد ازاں نثر۔ اس کی ابتدا صوفیا نے کی۔ ایک تو اس لئے کہ وہ سماع کے شائق تھے، دوسرے وہ اِسے تلقین کا سب سے کارگر اور بہتر ذریعہ سمجھتے تھے کیوں کہ دوسری کوئی ایسی زبان نہ تھی جو ہر جگہ سمجھی جا سکے۔ قاضی صاحب کا کلام ہندی میں ہے۔ یعنی وہ ہندی جو دہلی کے علاقے میں مروج تھی۔ بحریں بھی ہندی ہیں۔ کہیں کہیں مقامی گجراتی اور عربی فارسی کے لفظ بھی آ گئے ہیں۔ عربی فارسی کے زیادہ تر وہی لفظ آئے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ یعنی تصوف کی اصطلاحات یا مذہبی لفظ اور اعلام۔ ان کے علاوہ عام الفاظ بھی ہیں جیسے فرمان، قبولی، حاجت، دوستی، وقت وغیرہ۔

یہاں کلام کا کچھ نمونہ دیا جاتا ہے:۔

محمود کیری بنتی صاحب آتنی مانیں   نبی محمد کی دوستی راکھہ پانیں

نس دن سیوا ہوں کروں ری او بھری سائیں کے دوار
تل تل تیرا سوزوں ناہوں تیرا مگ ہم پار اتار
نبی محمد مصطفےٰ ری ساچا گروا رسول،
محمود بندا بنتوی میری حاجت کریں قبول،
ہوں ڈھونڈوں میرے اللہ کوں سیونی میرے صاحب کوں
جاری بھتور سنسور ہنی کیسی ایک تل آنکھ ملائی
پوچھت پوچھت، ڈھونڈت ڈھونڈت میں اس کی سدھ پائی
پسر محمود کی سو ہی جانے جس ساتھی بن بسیا
کی جائے یہ جیواڑا میرا کی وے میر رسیا

کوئی ما یلا مرم نہ بوجھے رے بات من کی کس نہ سوجھے رے
دکھ جیو کا کس کہوں اللہ دکھ بھریا سب کوئی رے

نردکھی جگ میں کو نہیں میں پرتی پھر پھر جوئی رے
یوں مجھ پوچھیں سہیلیاں تجھ تن لوہو نہ ماس
چھاتی لاکھن ہیں گئی میرے سائیں کارن اپواس
ہیرے بھیتر دوں جلے میرے سائیں بن کوں بجھائے
وا الہا کوئی اکھے مجھ آ دتا ہنس دیوں تس بدھائے

میرا میرا کی کرد اپنا کچھ نا نہیں
کا ہے کوں کرب کرو نبجراب کے تائیں
ها بولو مت چلو کرو بھلائی
پاؤں تلے کی دھول کوں کھو کیسی برائی
آگیں بھونیں مان بھاؤ جی ہوتے جن کے
وے منبر کیدھر گئے بھول جنتی ان کے
تیرا آوے سب را ولا سب چھوڑ سدھارے
ادسر چوکے آج مت پچھیں پچھتا وے
پانچوں وقت نماز گزاروں دائم پڑوں قرآن
کھاؤ حلال بولو مکھ سا چا راکھو درست ایمان
چھوڑ جنجال جھوٹی سب مایا جی من ہووے گیان
کلمہ شہادت مکھ پنسارو جس تھے چھوٹو ندھان
دین دنی کی نعمت پاؤ جو جنت راکھو شانوں
محمود مکہ تھیں تل نہ بسارے اپنے دھنی کا ناؤں

تمام کلام صوفیانہ ہے۔ ہندی زبان اور ہندی رنگ میں ہے۔ لیکن اس سے اُردو کی ارتقائی حالت اور ابتدائی تاریخ کا پتہ لگتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان جو برج بھاشا کے مقابلے میں ناشستہ اور ناشایستہ سمجھی جاتی تھی اور دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کے عوام کی زبان خیال کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ کس طرح نامعلوم طور پر ارتقائی مدارج طے کر کے اس اعلا رتبے کو پہنچ گئی جو ایک شایستہ زبان کا حق ہے۔

(رسالہ "اردو" جولائی ۲۰ء)

حیدر آباد کا ایک شاعر خاندان

* — ملّا عشرتی
* — سید احمد ھنر
* — علی احسان

قدیم اُردو (یعنی دکھنی) کا نشو ونما دکن میں ہوا۔ چونکہ یہ زبان اہلِ علم کی نظروں میں کبھی مقبول نہیں ہوئی تھی لوگ بھول بھال گئے کسی نے توجہ نہ کی اور بہت سا قدیم کلام ضائع ہو گیا۔ اب جو کچھ ملا ہے وہ محض اتفاق ہے ورنہ کسی نے اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا تھا۔ خود وہ لوگ جن کے بزرگوں کا یہ کلام ہے اس سے ناواقف اور ان کی زبان سے نابلد ہیں۔ اِنھیں بھولے ہوئے شعراء میں سے ہم حیدرآباد کے ایک شاعر خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ سال[1] بھر سے زیادہ مدّت ہوئی کہ یہ کتابیں جن کا ذکر اس مضمون میں ہے ہمیں نواب عنایت جنگ بہادر کی عنایت سے مطالعہ کے لئے دستیاب ہوئیں جس کے لئے ہم علم دوست نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا۔

مُلّا عشرتی

ان کا نام سیّد محمد تھا۔ سادات حسینی سے تھے۔ ان کے والد ہندوستان میں آئے اور دکن میں رہ گئے۔ پہلے ان کا تعلق عادل شاہی حکومت سے تھا۔ بعد میں حیدرآباد پہنچے اور اگرچہ درویش منش تھے لیکن بادشاہ کے ہاں عزت و وقار تھا اور منصب و خدمت سے ممتاز تھے۔ عشرتی نے فارسی پدماوت بھی لکھی ہے جس کا ماخذ ملک محمد جائسی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف نے عالم گیر کی مدح لکھی ہے اور خاتمے پر حیدرآباد کے چار محل کا استعارہ کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس زمانے میں گذرے ہیں جب کہ حیدرآباد پر اورنگ زیب کا قبضہ تھا اور صوبہ دار نگرانِ کار تھے۔ اس کتاب کے مادۂ تاریخ سے بھی جسے عشرتی نے کتاب کے خاتمے پر نظم کیا ہے اس کے زمانے کا پتا لگتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

بہار افروز دل شد چوں کلامش   "گلے ختمی" است تاریخ تمامش

(گلے ختمی) سے سنہ ۱۱۱۰ ہجری نکلتا ہے۔

عشرتی کے پوتے احسان نے (جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اپنی کتاب (قصۂ حاتم طائی)

کی ابتدا میں اپنے خاندان کا کچھ ذکر کیا ہے وہ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

برکت کا باعث بزرگوں کا نام ہے روشن کر اک کارگر کا تمام
کروں نام سید محمد کا یاد سیادت کے گھر کا ہے ذات الحماد
علی ولی کا ہے الحق پسر حسینی تھا سید وہ عالی گہر
جہاں میں تھا گرچہ تاہل کے ساتھ منش پاک آزاد عالی صفات
نہ دنیا کے کاموں سے کچھ میل تھا نہ کچھ حرص کا دل کے گھر خیل تھا
دکن کے تھا مرجع کے پاس اس وقار کہ منشی و ناظم تھا شہرہ دیار
معزز بہ جاگیر عز و وقار تھا ممتاز از درگہ شہریار
نظم اس کی خاطر صدف کا گہر ہے یک موج بحر فکر کا نثر
تصانیف نظم و نثر فارسی بھوت اس سے ہے عقل کی آرسی
ہے دکنی میں دیپک پتنگ چت لگن دو قصے کہ بس ہیں و عالی سخن
تخلص ہے مشہور اس عشرتی معارک سخن کا تھا خود نصرتی

دکھنی میں ان کی دو کتابیں ہیں جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے۔ ایک "دیپک پتنگ" اور دوسری "چت لگن" میری نظر سے نہیں گزری لیکن "دیپک پتنگ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عشرتی ایک پختہ شاعر تھا۔ کلام میں حسن و ذوق پایا جاتا ہے۔ زبان صاف اور فصیح لکھتا ہے جس سے شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔ قصہ عام قدیم قصوں کی طرح حسن و عشق کا ہے جس کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اس کی شاعری ضرور قابلِ داد ہے۔ اب میں اس کی شاعری کا رنگ دکھانا چاہتا ہوں ـــ

ابتدا میں حمد ہے، اس کے بعد نعت و منقبت، پھر اپنی تعلی، دکھنی میں لکھنے کا عذر، عشق کی کارستانیاں وغیرہ لکھ کر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

حمد

الٰہی تو ہو جیا زمین ہور زماں دیا پایا سورج جوت سوں آسماں

فلک کو سنگایا[1] تو گردش کی چال　　سیہ فس لایا[2] چندر کا ہلال[3]
رین گھن کا منڈوا سنواری تمام　　انگوراں کے جھونکے[4] ستارے تمام
فلک کی کیا تو[5] یچ کرسی بلند　　توں بھی کی چتر سال نقشبند[6]
سگل دل ہیں تجھ حکم کے کار دار　　مٹی کی پٹی تو چترِیا نگار[7]
تون پانی پو کھینچیا عجب یک رقم　　کہ مانی کے نقشاں پو توڑیا قلم
پریشاں ورق دل گرفتار کون　　شرازہ بندیا زلف کے تار کون
توں میں دیا پھول کون رنگ و بو　　دیا بلبلاں کون انجھو آبرو
غسل خانہ عاشق کی انکھیاں کا جم　　کیا تون حسن کی سورج لے گرم
چمن کے عروساں دیبایا سو تونچ　　سرو قد کون جلوہ سکایا سو تونچ

نعت

محمد نبی فخر کونین کا　　چھتر گگن[9] کے سر جس کے نعلین کا
صدف اس کے موتی کا ہے جسم و جان　　عرض اس کے جوہر کا کون ہور مکاں
ولیاں کا کعبہ نبیاں کا امام　　کیا جس پو حق نے نبوت تمام
وہ رحمت اہے خاص اللہ کا　　شرع اس کا ہادی ہے گمراہ کا
اسی سو نچ بدسور درشن ہوا　　علم ہور عمل اس تے روشن ہوا
ظہور اس تے ہے فیض رحمان کا　　وہی ترجماں بھید قرآن کا
دنیا دین کا دو وچ کعبہ ہہی　　حسن کی صورت کا ہے معنا وہی
ہے دس بدسپورن دھرنہار تونچ　　اگم[10] بھید پر گھٹ کرنہار تونچ

منقبت

دو جگ کا ہے سلطان علی ولی　　سگل مومنا کا ہے قبلہ علی

---

(۱) سکھایا (۲) رات (۳) نکلیا (۴) خوشے (۵) توہی (۶) نگار خانہ (۷) نقش کیا (۸) آنسو (۹) آسمان (۱۰) اتھاہ ناقابلِ فہم

نبوت سمندر[۱] نور اس کا صدف — ہے نرمل گہر تس ہیں شاہ نجف
ازل کے دریا کی صدف میں مقیم — تھی ہم سنگ یک بوند در یتیم
جو اس بند سوں جب مبارک گھڑی — رتی جوت طالب کے چک[۲] ہیں پڑی
تب اس ہیری لپستی ادک ذات سوں — تجلی بھری طور کی جوٹ سوں

وجہ تسمیہ کتاب

جے کچ اگ دل جیب پر لا بچھلی — زبان جگ کے کاناں ہیں وو اگ پلی
برہ کے جو بھیداں لکھا بے درنگ — رکھیا نام اس کا سو دیپک پتنگ

تعلی اور دکھنی میں لکھنے کا عذر

جن جن شعراء نے دکھنی میں نظمیں لکھی ہیں انھوں نے اس زبان میں لکھنے کی معذرت بھی کی ہے اگرچہ اس زمانے میں دکھنی نظم کا عام چرچا تھا۔ تو بھی فارسی کے مقابلے میں اس کی قدر نہ تھی۔

غواصی اگر دیکھت آج کون — موتی کے نین جل میں ڈب لاج سون
مچھی جیب دھر صدف اب منجھار — دعا کے گہر بچ پو کرتا نگار
نہ نکلیں جنم بھر بدخشاں سوں — جے گوہر نپجے[۳] ہیں مجھ کہاں سوں
ایکٹ[۴] ہوں میرا اس فن میں اس دھات سوں — کہ ہے چھانوں اپروپ مجھ ذات سوں
حقارت سوں مت دیکھ اس ھد کون — نجھا[۵] دیکھ جوتی رتن پاک کون
تنہا تجھ سے منگتا ہوں انصاف میں — نہ منصف دسیا مجکوں سب باج کیں[۶]
کہ کس گت سوں باندیا ہوں بانا زی — دیکھی تو مجھ کو چ نسبت نہوی
ہر ایک شعر کا ہر کسی نام نین — سو دکھنی کتا کچھ مرا کام نین
اگر فارسی کی تو امرت پلانوں — سحر گر کو کوزے میں سمدر کون بانوں

---

۱ سمندر ۲ آنکھ ۳ پیدا ہوتے ہیں ۴ تنہا ۵ غور سے دیکھو ۶ کہیں

پتر کے اوپر ناچتی ہے قلم عجب نین ہے پسلے جو اس کا قدم
ہے نوسکھ دکھن سال کے دھانوں کی اول سوں بچاری ہے یک پانوں کی
نوں اسکی خطا پر نہ ہر ایک ٹھار یو کاڑی کون کرو وک تیوں باو دار

ایک دوسری جگہ پھر دکھنی میں لکھنے کا ذکر کیا ہے۔

ہندی جو عران کا ہے دل آرسی دکھن میں دھکاؤں اگن فارسی
کروں سازیوں عاشقاں کا فراق اچھے راگ دکھنی ہور نما عراق
یو تحفا حسن عشق کا مال سون سو بھیجوں دکن تے خراسان کون
کہائی کے پردے ستی لب منجھار دیپک اور تپنگ کا کروں سوز بہار

آگے چل کر ایک بار پھر تعلی کی ہے اور خوب لکھا ہے۔

پتر پر کنچن نیر ڈھالیا ہوں میں برہ مس میں سورج کو ڈھالیا ہوں میں
مرا کلک کاغذ پر اُڑتے پران لگایا دو جبریل کے شہپران
بچن نے یہ اس پر کا آواز ہے درود اس پر بھیجے سر شہباز ہے
ولے عیب جویاں کے ہٹ سوں بچن پتر کاج پہنے ہیں سب پیرہن
رکھے اس پو انگلی کسے کیا مجال سنپیڑ شی نہ چکی میں زنگی کے بال
ہما منج قلم کا لیا جیب پونچ ستیا ہے سو کھے ہاڑ پر گرچہ چونچ
ولے مغز معنی ہے اس شیر میں بچن سوں ستیا ہے شکر شیر میں
ستیا ہوں جو بھین میں قلم کا تراش فلک خاک بیزاں نمن کر تلاش
رو ہلڈ بھین میں کوچ پایا گیا اپس کی دکاں کا سو مایا گیا
بچن کا رتن ہے جو مجھ کان میں سو چوکھیا طبیعت کی میزان میں
قلم مرغ خوشرنگ پیارا دسے مشخ کاج دانا ہی چارا دسے

اسی میں حیدر آباد کے چو محلے کی طرف استعارتاً اشارہ کیا ہے۔

کہ معشوق الفاظ کے سیام رنگ رہتے ہیں ل اس بھین منے ایک سنگ

۱؎ تنکا ۲؎ رد کھا درخت ۳؎ فخر ۴؎ سونا ۵؎ چٹکی میں زنگی کے بال نہیں آسکیں ۶؎ سر ۷؎ زمین ۸؎ ڈھونڈا ۹؎ کچھ کچھ ۱۰؎ مشک۔

ہر یک چار گوشہ ورق بے مثال ۔۔۔ دسے حیدر آباد کی چار محال

اس مثنوی میں صنائع بدائع سے بھی خوب کام لیا ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور لفظی رعایتوں کی کمی نہیں، جنھیں دیکھ کر گلزار نسیم یاد آجاتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کر گھائل دل اس رن میں منصور ہے ۔۔۔ اناں سر لہو کھاوے سو من سور ہے

ہوا سون جو سبزے پو بند آپڑے ۔۔۔ ہرے پانچ[1] پر جیون کہ موتی جڑے
گل شبو کھل کر ہوا شب چراغ ۔۔۔ دھویں سوں کیا انس کا خوشبو دماغ
پنکھی تان گاتے تھے خوش سوا چا ۔۔۔ درختاں کے پاتاں سوں باجے بجا

ملے جا چندر سور یک برج میں ۔۔۔ ملے لعل یاقوت یک درج میں
جو سعدیں تھی سات امرت بھری ۔۔۔ مشاطہ ہو جلوہ دیتی مشتری
دعا منگنے ہاتاں اچا یا چنار ۔۔۔ کلی گل کی آئین کہتی[2] اب منجھار
مشاطہ جو جلوے کوں تلنے لگی ۔۔۔ وو[3] بارے سورجوں پھول ڈلنے لگی
منڈپ پانچ کا گھن نے تانیا اکھنڈ ۔۔۔ چمک لا ستاریاں ستی چار کھنڈ

چڑیا تجھ نین جام کا سر خبار ۔۔۔ سینے میر گزک لہو کی باداں انار
تو رنج مجھ تے نا کھینچ اگر کیچ باے ۔۔۔ اکیلا ج اچھ توں جو نارنج پائے
نہ کمرک میا آملو نگی تجھے ۔۔۔ سدا سیو تی میں اچھو نگی تجھے
حیاتے کیا[4] سیتا کوں رام پھل ۔۔۔ جیوں مرکو سو بیر[5] تج آس بلد

بعض جگہ فارسی محاوروں کے لفظی ترجمے کر دیئے ہیں مثلاً دنبال لینا (دنبال گرفتن)

---

[1] کانچ [2] کہتی [3] ہوا [4] کہا [5] بار

جو بھو تیج دنبال لی او اجھول | کیا تب وہ رانیں نے رانی سے کھول

گرم و سرد زمانے کا ترجمہ دیکھئے :

دیکھی آزما جگ کا ٹھنڈا تتا

یا اسپ صبا رفتار کا ترجمہ "پون پگ گھوڑا کیا ہے

ایک جگہ " دال میں کالا" کا محاورہ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورہ اس وقت بھی رائج تھا۔

کہ دستا ہے کالا سو کچھ دال میں | جو ہے گھابری نار اپن حال میں

بعض بعض شعر بہت صاف نکل گئے ہیں۔ مثلاً

ہر ایک دل میں لتس عشق لے راز ہے | اکین دل منے سوز اکین ساز ہے

یقین ہے پیو بن جیا جائے نا | پیا باج امرت پیا جائے نا

یہ شعر سلطان قلی قطب شاہ کے شعر سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا | پیا باج یک تل جیا جائے نا

ہر باب کے ابتدا میں اکثر یا تو راوی کی طرف سے قصے کا بیان شروع ہوتا ہے یا کسی قدرتی منظر کے بیان سے آغاز کیا جاتا ہے۔ مثلاً

صبح دم چلی باد کر نو بہار | کھلے پھول بن بن ہوئے لالہ زار

چلیا صید کہ سیر کرتا دو راج | ہوا دیں کہ یک پنت میانے دو کاج

یا

کہنہار قصد ہندی یک یو ریک | شمع اور پتنگ کے درد کا شریک

---

۱ گھبرائی ہوئی۔

سیّد احمد ہنر

سید احمد تخلص ہنر ملا عشرتی کے فرزند ہیں۔ ان کی تصنیف سے دو کتابیں ہیں۔ ایک "نیہ درپن" اور دوسری "اوتار بن" ان کے بھتیجے علی نے اپنی کتاب "گلشنِ احسان" میں جہاں اپنے خاندان کا ذکر کیا ہے اور جس کے کچھ اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں وہاں ہنر کا بھی ذکر یوں کرتا ہے۔

سیوک اس پدر۱ کا تھا اس نام دار — سو تھا سید احمد فضائل مدار
بہ جاگیر و ہم باخطاب گزیں — مخاطب تھا با احترام متیں
قدم بر قدم بل پدر سوں زیاد — تصانیف اس سوں بھی ہے بہت یاد
کہ ہے نیہ درپن و اوتار بن — دو قصے ہیں دکھنی ہنر در سخن
سخن کے ہنر کا تھا صاحب اثر — تخلص و عالی منش کا ہنر
جہاں میں ان ستی یادگار — سراسر جہاں گرچہ ہے بے مدار

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنر بھی صاحب جاہ و منصب تھا۔ اس کی مثنوی "نیہ درپن"

۱؎ یعنی عشرتی کا

میرے مطالعہ میں آئی ہے۔ قصہ اسی قسم کا ہے جیسے ہمارے ہاں کے پُرانے قصے ہوتے ہیں۔ راج پتی اودھ کا راجا تھا۔ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ رات دن اسی فکر میں گھلا جاتا تھا۔ ایک فقیر کی دعا سے بیٹا پیدا ہوا۔ نام اس کا کامروپ رکھا۔ بڑا ہوا تو خواب میں شہر سنگلدیپ دیکھا۔ راجا وہاں کا چھترپتی اور بیٹی کا نام کاملتا۔ یہیں سے عشق کی چنگاری بھڑکی اور قصے کی ساری روئیداد اسی میں ختم ہوگئی۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ چناں چہ سبب تالیف کے تحت میں وہ خود اس کا ذکر کرتا ہے۔

بہت سے یار دوست جمع تھے اور طرح طرح کی نکتہ سنجیاں اور گل فشانیاں کر رہے تھے:-

تھا اس مجمع میں ایک شخص نادر — سخن کے رمز کا تھا خوب ماہر
سخن کے بحر کا تھا آشنا خوب — اتھا بھی آشنائی بیچ مرغوب
لے کر آیا کتاب یک اپنے سات — سراسر اس منے تھی عشق کی بات
عبارت نثر اس کی فارسی تھی — برت سندر سدھن کی آرسی تھی

اور کہا کہ تم سے کوئی دکھنی میں اس کا ترجمہ کرے۔ سب نے میری طرف اشارہ کیا کہ اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ غرض سب نے مجھے مجبور کیا اور میرے دل میں بھی ایسا جوش پیدا ہوا کہ میں نے اسے نظم کر ڈالا۔

یو قصے کو کیا میں ترجمہ خوب — لگیا ہر ایک کی خاطر میں مرغوب

یہ قصہ ہنر نے ابن نشاطی کے "پھولبن" کے جواب میں لکھا ہے۔ چناں چہ کتاب کے خاتمے کے اشعار میں لکھتا ہے۔

بنایا پھول بن ابن نشاطی — مٹھی باس اس کی سب کے تیں خوش آتی
جواب اس جو یو ہے نیہ درپن — ہے سچ وہ عشق کی انکھیاں کا انجن
اسے اس لے اگر نا پائے بہتر — برابر تو یقیں جانے نہ کمتر

اس کتاب کے لکھتے وقت ابن نشاطی کا خیال پیش نظر رہا ہے چناں چہ دیباچے

میں بھی کتاب کا نام بتاتے وقت "پھولبن" کا ذکر کیا ہے۔

لکھیا میں مختصر کر یو حکایت — جو تھی لُنبی[1] کچھ دراز اس کی روایت
اگر کر اس منے فن شاعری کا — ہنر اس میں دکھاتا ماہری کا
تو ہوتی بھوت یعنی یو حکایت — پڑھنہارے کون بھی اتے ملالت
مجھے ابن نشاطی کا سخن خوب — لگیا دل میں بہت محبوب و مرغوب
کتاب اس کی جو ہے نام اس کا پھلبن — نزاکت کی ہے در گلبن کا گلشن
وہ گلشن دکھیا وہ ناؤں پھلبن — رکھیا میں ناؤں اس کا نیا درپن

غوث الاعظم کی منقبت میں پھر اس خیال کا اعادہ کیا ہے۔

"یہ کتاب سنہ ۱۱۴۴ ہجری میں تمام ہوئی۔ خاتمے پر شاعر نے خود سنہ بتا دیا ہے۔

ہوا تیار جب دلیّاں[2] میں پھول بن — مصنف تس لکھیا ہجرت کے یوں سن
سن ہجری لے آیا جب یو رکھ بار — اگیارا سو کون کم تھے بیس پر چار
سٹیا مج نیہ درپن نے یو جھلکار — اگیارہ سو پو تھے چالیس پر چار
محبت کی جو ہے عارس[3] سلکھن — اسے ہے رونما یو نیہ درپن
ہوا جب کامل اس کا نظم ہر حال — زمانے نے کیا مج بھوت خوش حال
کہیا تاریخ یو رخ منج رخن کا — یو لو تحفہ مبارک[4] لے ہنر کا

آخری مصرع سے پوری تاریخ نکلتی ہے۔

شاعر نے ابن نشاطی سے مقابلے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کا دعوا کچھ بے جا نہیں ہے۔ اس کی مثنوی کسی طرح ابن نشاطی کی پھلبن سے کم نہیں ہے۔ روانی اور فصاحت کے ساتھ حسن تخیل بھی موجود ہے۔ ابن نشاطی کو تقدم کی فضیلت حاصل ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے ہنر اس سے کم نہیں ہے۔ اس کے بھتیجے علی نے سچ کہا ہے "قدم بر قدم بل پدر نے زیاد"۔ اور پھولبن کے بعد درپن کو پڑھ کر ہمیں بھی ہنر کا ہم نوا ہونا پڑتا ہے۔

اُسے اُس تے اگر نا پائے بہتر
برابر تو یقیں جانے نہ کمتر

۱۔ بہت ۲۔ دلوں ۳۔ عروس ۴۔ بہت

اب میں اس مثنوی سے بعض مقامات نقل کرتا ہوں۔ ان سے اس کی شاعری کا خاصا اندازہ ہو جائے گا۔

حمد

الٰہی یا الٰہی یا الٰہی ۔۔۔ تجھے ساجے جگت کی بادشاہی
تکبر اور منم ہے تجھ سزا وار ۔۔۔ کہ نہیں کوئی دوسرا تج سار کرتار
دکھانے جب منگے قدرت کا تو بل ۔۔۔ کرے بھیں گھن پو گھن کو بھیں کرے تل
نمونہ تج سخاوت کے ہے کر کر ۔۔۔ کرے بھیں کون ہر روز پر زر
رو پا چندنے کا چندر ہر رین گال ۔۔۔ سٹے بھیں سدا جیوں دودھ بھر تھال
جہنم تجہ غضب کا یاد کر کر ۔۔۔ لرزتا ہے سدا سورج گگن پر
کرم بارا ترے کر قہر کو یاد ۔۔۔ چرخ میں ہے فلک جیسا گرد باد
جو بھید یا لبس تری ہیبت کا اس انگ ۔۔۔ ہریا ہے تن فلک کا پاج کا رنگ
تری صنعت کر انقاش اپروپ ۔۔۔ چتاریا باغ میں کے نقش مرغوب
رنگ آمیزی کیا صفحۂ چمن کا ۔۔۔ کہ جیسا کام ہو نازک کندن کا
نکھیا یوں موج کی جھنکراج جل پر ۔۔۔ کہ جیوں درپن اپر نکلے ہیں جوہر
دکھایا سنبلاں کو گل سوں مل کر ۔۔۔ کہ جیوں نیچا دھواں انگار اوپر
کلیاں آدھی کھلیاں ہر پھول بن کے ۔۔۔ ادھر[1] ہیں مسکے[2] میں جیوں سولن[3] کے
چمن رنگین پھولاں سوں یو سہائے ۔۔۔ چکن کی سوزنی جیوں چن بچھائے

آخری شعر میں تشبیہ خوب ہے۔

نعت

رک ہیں نعت حضرت مصطفےٰ کی ۔۔۔ محمد سرور دین مجتبےٰ کی
سہائے سر[4] پر اس تاج لولاک ۔۔۔ تخت سو لامکاں کرسی ہے افلاک

---

۱ ہونٹ ۲ مسکراہٹ ۳ معشوق ۴ سر

کرن کی بات لے سونے کون خوبی | کرے تج در کی سورج خاکروبی
ہوکر فراش تجھ مندھر کے اندر | بچھاوے چاندنی چندنے کی چندر

منقبت حضرت علیؓ

خدا کا فضل جب ہوتا ہے رہبر | تو ہوتا خشک گلشن عقل کا تر
مکدر صاف ہوتا دل کا درپن | غبار اُٹھ خوف کا ہوتا ہے روشن
محمد لفظ علی معنی ہے کامل | محمد شہر علی ہے باب حاصل
نہیں لخت جگر احمد سوں نیارا | ہے جوڑا فاطمہ کا حق کا پیارا
کرے ہر روز سورج آسماں سوں | کہ دیوے بوسہ لس کے آستاں کوں

مدح حضرت عبدالقادر جیلانیؒ

عجیب بات ہے کہ اصحابِ رسول اللہ کی منقبت تو نہیں مگر غوث الاعظم کی مدح موجود ہے۔

محی الدین ہے وہ غوث الاعظم | سورج جس نور انگے ذرے سوں ہے کم
جگت کے ہیں جتنے صاحب ولایت | شرف رکھتی ہے جن سیتی کرامت
نرنجن کے وہ سب عاشق کو آئے | محی الدین معشوق کون پائے
یہ تحفے کو سمجھ کر میں سزاوار | لے آیا نذر شاہنشہ کے دربار
بندیا ابن نشاطی وہ سخن ور | کتاب یک قطب شہ کے ناؤں اوپر
ہنر نے یاو رکھ اس نظم کا دھانوں | بندیا ہے نامہ ایسے قطب کے ناؤں
سوان سو قطب ولے جس در اوپر | کمینے چاکراں سیتی ہیں کمتر

ایک اعتراض کا جواب

رکھیں گے کوئی مجھ پر بول گیانی | کہ ہے اس بیچ ہندو کی کہانی

ما کہلائے۔

مسلماں کو کہنا ہندو کی کہانی نہیں کسی باب لگتی ہے سہانی
میرا مطلب ہے کرنا عشق کا یاد کفر ہور دین سو دہے عشق آزاد
خلاصہ ہے جے کچھ سو عشق ہے عشق ہے عشاقاں کہ ہَن[۱] سو عشق ہے عشق
مسلماں ہووے کوی یا ہووے کافر ہے بہتر وو کہے جو عشق ظاہر
شکر ہے حق کا جب تے میں ہوا ہوں سدا جیو عشق کے میانے دیا ہوں
کرم حق کا کیا جب دستگیری ہوئی تب آرزو مجھ دل کی پوری
یو قصے کوں کیا محنت سے آخر کیا موتی گپت[۲] سمدر کے ظاہر

فراق کی کیفیت

خدا کے تئیں یک نس خواب میں آ تو جاں رہتی سو وو جاگے کوں بتلا
اگر ہووے گھر پر دے سات اندر سورج کی جوت تیوں باہر کروں سر
فرشتے کے نمن[۳] ہو اس ستی پار ملوں آ کر تجھے اے دل کے دلدار
اگر ہووے تج رہنے کا بھیں تلے گھر بُھواکر[۴] فیر کا دو چک[۵] سوں[۶] سرور
زمیں کوں نرم کر پلکیاں ستی چیر دھسوں پاتال کے بھتراں جوں نیر

باغ کا بیان (خوب لکھا ہے)

اتھے کچ جھاڑ مل کر ڈال سوں ڈال بنے ہیں جیوں ہرے ریشم کرا جال
پنکھی بیٹھے سو مل دستے اُکٹھے یوں کہ اس جالنے منے سنپڑے[۷] اہیں جیوں[۸]
گل لالے پو شبنم آتے یو درس مگر کیا حق کی قدرت کا مہوس
رکھیا پارے کے تئیں انکار اوپر کر اکسیر ہور اکسیر سوں زر
دسیں صد برگ کے تختے ہر یک ٹھار ہوا ہے اس عمل کا ہیچ یوں بھنکار

۱؎ نزدیک ۲؎ پوشیدہ ۳؎ مانند ۴؎ جھاڑو دے کر، صاف کر کے ۵؎ آنکھ ۶؎ تالاب
۷؎ پھنسے ۸؎ جیو بمعنی جی کی جمع۔

ہریالی بھیں اوپر یوں لہلہائے
ہریا جیوں تا فتا چن کر بچھائے

لگا لگ لگ پوں لہاراں[1] سو بھی یوں
کا ریگر مگر الٹو کرا جیوں

دسے نیر اس اوپر بہتا سو اس دھات
کہ جیوں بسما کرے روپے کے سنگات

لگے سو پھل ہو ایک جھاڑاں کے شاخاں
دسیں جیوں دان میں ڈالنے کے ہاتاں

نچھل جل کے دسیں چشمے ہر یکٹھار
نمن درپن کے نرمل ہور صفا دار

دسے لالے کا سایہ جل میں ہر ٹھار
کہ جیوں لالے ہیں پانی بیچ انگار

رات

ڈبیا جب سور کا مغرب منے جاز[2]
رین کا بادبان کھل کر ہوا واز[3]

رین سوں گھن ہوا ظلمت کا سمدر
ہوا چاند اس سمد میں ماہئی نور

ستارے گھن اپر ہستے اٹھے یوں
ہیں اس مچھلی کھو[4] نے نیر پر جیوں

لڑائی کا بیان

دلیراں نے صفاں آراستہ کر
دیئے تھے مردمی کے داد یک سر

پڑے ہر تن اُپر واراں ستی غار
بدل پانی کے نکلا لہو کا انگار

لگا چھاتی سے چھاتی ہو کو کلجوڑ
سٹے سر ہور سینا ہور ہات پگ توڑ

کرے گرزاں کی ایسی دھات سوں مار
پڑے تھے دھرت[5] کون پاتال لگ غار

وہاں پڑے ہو ان میں پامال
پڑے جیون[6] میں بھین اپراں[7] بے حال

کڑالیں پھوڑ ہر یک ہاتھ کا تیر
کہ چومیا ہات ہر ایکس کا راہ گیر

دھنک جب کھینچتا ہر ایک کمان دار
چلا کہتا زہ ہا زہ اس کون ہر بار

دسے یوں پاکھراں سوں ہشت[8] کا دل
کہ جیسا نیر بھر بادل دیا چل

ادئے زخمیاں کا عکس اس میں لگت لو[9]
دکھایا جیوں شفق بادل منے موں

---

[1] لہروں [2] جہاز [3] کشادہ [4] فلس [5] زمین [6] مچھلی [7] اوپر [8] ہاتھی [9] خون

آم کا درخت

اتھا اس گلبرن رہنے کری ٹھار — اچھا آنب کا جھاڑ ایک پھلدار
ہویا جیوں پاچ کا گنبد مکان — لتس اوپر زر کی قندیلاں پکے پھل
ڈلے بارے سوں جب دستا تھا اس دھات[۱] — کہ حالت بیچ ہے زاہد ہلا ہات
ہرے پاتاں کے سبز اس گل میں پیرن[۲] — پھلاں سو کھربا کی ہت میں سمرن

بعض بعض تشبیہیں خوب لکھی ہیں مثلاً :-

وہ نازک پگ ہوے لگ کر جھرانٹے[۳] — کہ جیسے پاؤں لگ کر پھول پھانٹے

یا

چلے ہر ایک اپنی بات لے کر — نہ دیکھے نیر بہتے نار پھر کر

یعنی ہر ایک اپنے اپنے رستہ چلا گیا اور بہتے پانی کی طرح کسی نے پھر کے نہ دیکھا۔

کتاب کے ہر باب کے شروع میں بطور عنوان کے ایک شعر بالالتزام آتا ہے اور عنوان کے یہ تمام شعر ایک ہی بحر میں اور ایک ہی قافیے کے ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کر لیا جائے تو قصے کا خلاصہ نکل آتا ہے۔ کتاب کا ابتدائی شعر یہ ہے۔

ثنا ہے حق تعلی کا وہ ہے سب علم کا گیانی
یگنگ ہے ہور فرگن ہے دوجا نہیں کوئی اسے ثانی

---

۱ طرح ۲ پیرہن ۳ خراش ۴ مانند مثل

علی احسان

یہ سید احمد ہنر کے بھتیجے اور سید محمد عشرتی کے پوتے ہیں۔ احسان تخلص ہے لیکن علی بھی تخلص کے طور پر جا بجا لکھا ہے۔ اس نے قصہ حاتم طائی کو نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی ضخیم ہے۔ قصۂ حاتم طائی کے منظوم ترجمے کئی ہیں۔ ان میں مہمان کا زیادہ مشہور ہے۔ فائق نے بھی نظم کیا ہے لیکن اس کی زبان دکھنی نہیں ہے۔ دیباچے میں اپنے دادا اور چچا کا حال لکھا ہے جسے میں پہلے نقل کر چکا ہوں شاعری میں اس کا رتبہ دادا اور چچا سے کم ہے۔ مثنوی اوسط درجے کی ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وجہ تالیف میں خود ہی لکھا ہے کہ فارسی کا ترجمہ ہے کتاب کا نام اور سنہ تالیف بھی لکھ دیا ہے۔

گلستاں ہوا احساں کا ہے کر تمام — رکھا گلشن احسان میں اس کا نام
ہوا گلشن احسان جو بار ور — تمامی کا لایا جو تازہ ثمر
بندھا آب سال اس کو یوں باغباں — یہ تحفہ علی کا اچھے دوستاں

آخری مصرعہ سے سنہ ۱۱۶۹ ہجری نکلتا ہے۔

ابتدا، حمد سے اس طرح کی ہے۔

کرے کیا کوئی اوسکی حمد و سپاس — کہ ہے ذاتِ یکتا وہی بے قیاس
ہوا تھا جو اس کو تماشے کا ذوق — سو اک آن میں اون کیا تحت و فوق
چمکنے لگے پھر تو شمس و قمر — ستارے جُدا ہو گئے جلوہ گر
بنے عرش و کرسی و لوح و قلم — فلک ہو گیا اوس کے سجدے میں خم
ملائک جدا ہو گئے جا بجا — یک ایک کو صدرۃ المنتہیٰ
لگے مشورہ کرنے غلمان و حور — کہ دوزخ بہشت اور وحش و طیور

خاتمہ

ہے شکر الٰہی ہزاروں ہزار — جو دیوے ہے امید کے دکھ کو بار
علی کچھ تجھے اتنی قدرت کہاں — عیاں شکر حق کا کرے تو بیاں
سو لکھ میں شکستہ کتی بات کون — برابر کیا ہوں حکایات کون
ردیف اور نہیں قافیہ سے خبر — نہ کچھ شعر کے فن میں ہوں معتبر
متاع اپنی گر میں سمجھتا الوب — چھڑک بیچتا اوس کو خوش ڈھانپ ڈھوب
ولیکن یہ گوہر نہ محنت سوا — صدف سے مرے دل کے باہر ہوا
بصارت ہو جس کو تو انصاف سے — چونے پوت کو گوہر صاف سے
پڑے جس نظر میں یہ قصہ سند — دعا سے میرا نام لے لب اوپر
خدایا مرے دین و دنیا کے کام — تو کر ختم بالخیر جو ہیں تمام
بحق محمد و آلِ عظیم — گنہ بخش میرا غفور الرحیم
دے ساقی شراب اب جو کچھ نین خیال — جہاں ہے کدورت سراسر ملال
کروں میں نہ دوناں کی منت کشی — ہو کوثر کے ساقی کا میں منتی

ہر باب کا عنوان ایک شعر ہے۔ اور عنوانوں کے تمام شعر ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں۔ مثلاً:-

یہ ہیگا التجا بندے کا درگہ میں اپس خالق کی زاری سوں
شجر ایسے کوں مطلب کے کریں شیریں ثمر دے کر

آخری باب کے عنوان کا شعر یہ ہے —

بجالاتا شکر حق کا اپس خالق کی درگہ میں
ہوا یوں فضل کے بادل سوں گلشن تازہ تر بہتر

ہر باب کے آخر میں دو شعر ساقی نامے کے ہیں جیسے ۔

دے ساقی مجھے مے کہ تا خوب رو — لگے خوب جب لگ رہے روبرو
بغیر مے نہ خوش آئے دل بر کسے — بجز دل ربا سے نہ خوشتر دسے

اور ہر باب کی ابتدا، صبح یا شام وغیرہ کے منظر سے ہوتی ہے مگر صرف ایک یا دو شعر ہوتے ہیں۔ جیسے ۔

ستاروں کے تجار کو شب مرید — صبح ہوتے ہوتے کیا جیوں شہید

یا

صبح کو مسافر نکل شرق کا — چلا غرب کو جلد ہو برق سا

(رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۱ء)

پُرانی اُردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں

آسمانی صحیفوں کے ترجمے کی مخالفت تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں کی گئی ہے اور یہ مخالفت ہمیشہ علمائے دین کی طرف سے ہوئی وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں عام ہوئیں تو لوگ ایک حد تک ان بزرگوں سے بے نیاز ہو جائیں گے اور اس سے ان کی بڑائی اور فضیلت میں فرق آ جائے گا۔ بعض اوقات مخالفت اس لئے بھی کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں ان کے منشاء کے خلاف تھیں اور ایسے مترجمین اور مفسرین کو تکلیفیں اور عقوبتیں پہنچائی گئیں۔ یہ روش کسی خاص ملک یا قوم سے مخصوص نہ تھی بلکہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ زمانۂ وسطیٰ میں یورپ میں انجیل و توریت کے مترجمین کو طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں اور علما کی مجلس نے ان صحیفوں کے ترجموں کے متعلق امتناعی احکام جاری کئے۔ ریمس (علاقۂ فرانس) کے ایک نان بائی الیشارڈ نامی کو بعض عقائد کی بنا پر جن کی وہ تلقین کرتا تھا۔ علما کی مجلس نے مردود ٹھہرایا، کفر کا فتویٰ صادر کیا اور زندہ جلا دیا۔ اور اس کے ساتھ مجلس نے فرانسیسی زبان میں

بائبل کے ترجمے کی ممانعت کردی۱۔ ترجمہ کرنا تو درکنار کسی کے پاس دیسی زبان میں ترجمے کا پایا جانا بھی جرم تھا۔ آکسفورڈ میں آرچ بشپ ارنڈل کی زیر سرپرستی ۱۴۰۸ء میں ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس میں یہ احکام صادر کئے گئے کہ "کوئی شخص اپنے اختیار سے بائبل کے کسی نسخے کا ترجمہ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کتاب یا کتابچے یا رسالے کی صورت میں کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ نیز کوئی شخص ایسی کتاب یا کتابچے یا رسالے کا نجی طور پر یا عام طور پر پڑھنے کا مجاز نہیں جو جان وکلف یا اس کے بعد یا اب لکھا گیا ہو، خواہ وہ ترجمہ کلاً ہو یا جزءً ورنہ اس کی خلاف ورزی میں وہ کفر و معصیت کا حامی تصور کیا جاکر قابلِ سزا سمجھا جائے گا۲"
اس زمانے میں انگریزی بائبل کے بعض ترجمے ہوئے لیکن کسی مطبع کو اُن کے چھاپنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مثلاً ولیم ٹنڈیل نے ایک ترجمہ کیا اور جب اس نے دیکھا کہ یہاں اس کا چھپنا ممکن نہیں تو بھاگ کر ہیمبرگ میں پناہ لی اور کولون میں اپنا ترجمہ چھپوانا شروع کیا۔ ابھی کتاب زیرِ طبع تھی کہ فرینکفورٹ کے ڈین کو اس کی سُن گُن معلوم ہوئی اس نے نہ صرف کولون کی سینٹ کے ذریعے اس کی طباعت روک دی بلکہ ہنری ہشتم اور ولزی کو لکھا کہ انگلستان کی بندرگاہوں میں خاص طور پر نگرانی رکھی جائے کہ اس ترجمے کا کوئی نسخہ وہاں داخل نہ ہونے پائے۔ ٹنڈیل نے یہ رنگ دیکھا تو (WORMS) بھاگ گیا۔ اور جس قدر چھپے ہوئے فرمے ہاتھ لگے ساتھ لیتا گیا۔ وہاں یہ ترجمہ طبع ہوا۔ سنہ ۱۵۲۶ء میں اس کے نسخے انگلستان پہنچے۔ لیکن ان کے برباد اور تلف کرنے میں اس قدر سعی اور جدوجہد کی گئی کہ سوائے چند ناقص اجزا کے جو برٹش میوزیم میں موجود ہیں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ اس کی عمر زیادہ تر جلاوطنی میں گزری۔ پادری اور حکومت اس کے درپے تھے۔ آخر سنہ ۱۵۳۵ء میں گرفتار ہوا۔

۱۔ مڈ ایول کلچر مؤلفہ ہیسکنس صفحہ ۲۴۸
۲۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۳ صفحہ ۸۹۷

سنہ ۱۸۳۶ء میں پھانسی دی گئی اور لاش دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دی گئی۔ انگریزی بائبل کا کوئی حصہ سنہ ۱۵۲۵ء سے قبل طبع نہ ہوا اور پوری بائبل سنہ ۱۵۳۸ء سے پہلے شائع نہ ہوئی۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے سنہ ۱۱۵۰ھ میں قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ مولف حیات ولی نے شاہ صاحب کے ایک فاضل ہم عصر کی زبانی بیان کیا ہے کہ جب "اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکۂ عظیم کٹ ملانوں کے گروہ میں برپا ہو گیا" اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے وہ شاہ صاحب کے جانی دشمن ہو گئے اور ان کے قتل کی فکر میں رہنے لگے۔ یہ ترجمہ شائع کرنے کا ذکر ہے، زبانی ترجمہ پڑھانے کے بھی ہمارے ملا اور علماء شدید مخالف تھے۔ میرے ایک دوست جن کے خاندان میں زمانۂ دراز سے علم و فضل کا چرچا چلا آرہا ہے فرماتے تھے کہ ان کے جد امجد علاوہ دوسرے علوم کے درس کے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ جب شہر کے علما کو یہ معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے ان کے گھر پر چڑھ آئے اور زدوکوب پر اتر آئے۔ فورٹ ولیم کالج میں جب بعض مولویوں کو قرآن شریف کے ترجمے کے لئے متعین کیا گیا تو اسی قسم کا ہنگامہ برپا ہوا۔

ابھی حال کا ذکر ہے کہ جب مسٹر پکتھال نے قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور وہ علمائے مصر سے مشورہ کرنے کے لئے مصر تشریف لے گئے تو علمائے مصر نے ترجمے کے لفظ پر سخت اعتراض وارد کیا اور اس بحث نے اسقدر طول کھینچا کہ آخر مسٹر پکتھال کو مجبور ہو کر ترجمے کے لفظ سے احتراز کرنا پڑا اور اس کا نام ——— (MEANING OF THE KORAN) "معانیٔ قرآن" رکھنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ پرانی ریت . . . مشکل سے جاتی ہے۔

خیر یہ تو ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں کو تہ اندیشی ہے۔ لیکن ایک مشکل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان صحیفوں کا ترجمہ آسان کام نہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ زبان پر کامل قدرت ہونی چاہئے۔ عقائد اور احکام کا دارومدار الفاظ کے مفہوم پر ہے۔ الفاظ

کا مفہوم مرورِ زمانہ سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے مترجم کے لئے لازم ہے کہ وہ جانتا ہو کہ جس زمانہ میں یہ کتاب نازل ہوئی اس وقت ان الفاظ کے کیا معنے تھے اور قائل کا ان سے کیا مقصود ہے۔ کبھی کبھی ذو معنی اور پہلو دار لفظ بھی آجاتے ہیں۔ ایک جماعت اس کا مفہوم کچھ لیتی ہے اور دوسری جماعت کچھ۔ اور ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک لفظ کے معنی یا نحوی ترکیب کی وجہ سے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گیا اور دو فرقے بن گئے ترجمے میں ایسے لفظ استعمال کرنا کہ ان میں بھی دونوں پہلو قائم رہیں بہت دشوار بلکہ اکثر اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود ترجمے میں اصل کی سی فصاحت اور قوتِ بیان اور اثر قائم رکھنا سب سے بڑا دشوار کام ہے۔ ایک طرف علماء کی مخالفت دوسری طرف یہ دشواریاں مترجم کی ہمت پست کرنے کے لئے کافی ہیں۔ باوجود ان مخالفتوں اور دشواریوں کے آخر مدت کے بعد ان صحیفوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو کر رہے۔ ترجمے نہ ہوتے تو ان کے مطالب تک ان لوگوں کی رسائی کیوں کر ہوتی جو غیر زبانوں سے ناآشنا تھے۔

اردو میں عام طور پر قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا رفیع الدین کا اور دوسرا شاہ عبدالقادر کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ترجمے تیرھویں صدی کے آغاز میں ہوئے لیکن اس کی بہت کم لوگوں کو خبر ہے کہ اسی زمانے میں اور نیز اس سے قبل ہندوستان کے مختلف مقامات میں متعدد ترجمے اور تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ اس قسم کی جتنی کتابیں ہمیں دستیاب ہوئیں یا ہماری نظر سے گزریں، ان کی مختصر کیفیت یہاں لکھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی ہوں جن کا ہمیں علم نہیں۔ ان میں زیادہ تر تفسیریں ہیں، لیکن یہ برائے نام تفسیریں ہیں۔ درحقیقت قرآن کے لفظی ترجمے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ یا ایک آدھ سطر صراحت کے لئے بڑھا دی ہے۔ ایک مشکل یہ آپڑی ہے کہ بعض میں مولف کا نام اور سنہ تالیف ندارد ہے یا بعض اول و آخر سے ناقص ہیں اس لئے یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ لکھنے والے کون تھے اور کب لکھی گئیں۔ البتہ زبان سے زمانہ تالیف کا تھوڑا بہت قیاس ہو سکتا ہے۔ بعض صرف ایک پارہ

سورۃ یا چند سورتوں کے اور بعض پورے قرآن کے ترجمے یا تفسیریں ہیں۔ بہر حال اس سے یہ اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ اس قسم کی کوشش مختلف زمانوں اور ملک کے مختلف حصّوں میں برابر ہوتی رہی ہے۔

اس قسم کی سب سے پرانی کتاب جو مجھے دستیاب ہوئی ہے وہ پُرانی گجراتی اردو زبان میں ہے۔ افسوس کہ یہ اوّل و آخر سے ناقص ہے اس لئے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتا چلانا غیر ممکن ہے۔ البتہ زبان کے ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دسویں صدی کے اواخر یا گیارھویں صدی کے اوائل کی تالیف ہے کیونکہ اس کی زبان امین کی "یوسف زلیخا" کی زبان سے کہ وہ بھی گجراتی اُردو میں ہے، بہت پُرانی ہے۔ امین کی "یوسف زلیخا" سنہ ۱۱۰۹ھ میں لکھی گئی اور یہ یقیناً اس سے پہلے کی ہے۔ یہ سورۂ یوسف کی تفسیر ہے۔ امین کی کتاب نظم میں ہے اور یہ نثر میں۔ ظاہر ہے نظم کی زبان زیادہ مشکل ہوتی ہے اور اس میں پُرانے لفظ زیادہ آتے ہیں اور نثر اس کے مقابلہ میں سہل ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر سادہ زبان میں لکھی گئی ہے اور بالکل بول چال کی زبان ہے۔ تاہم اس میں پُرانے لفظ اور پرانی ترکیبیں نسبتاً بہت زیادہ ہیں۔ یہاں میں اس کی عبارت کے ایک دو نمونے پیش کرتا ہوں۔

"قال رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن"۔

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"یوسف نے کہیا کہ اے بار خدا ہوں (۱) بھاکسی (۲) کوں دوس (۳) دھرتا ہوں اس کام تھیں کہ جے کام منجھے اے فرماتی ہے انے (۴) اگر تو منجھے انھوں کی مکروں تھیں پنہ منے (۵) نراکھے تو ہوں ڈرتا ہوں کہ ہوں بھی انھوں کی بات اوپر خاطر کروں انی سکلے (۶) گنہ گاروں منے ہووں"۔

"اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا واتونی باھلکم اجمعین"۔

---

(۱) میں (۲) قید خانہ (۳) دوست (۴) اور (۵) میں (۶) تمام

اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"یوسف نے کہا لے جاؤ میری پیرہنی انے (۱) باپ کے منہ پر چھوڑو تو دیکھتے ہوویں گے انے پیچھیں سکلے (۲) اپس کے کٹم کوں لیؤ انے (۳) میرے نزدیک (۴) آنو (۵)۔"

تفسیر کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

"پیچھیں بھاکسی کے عہدہ دار نے کہیا کہ وے دائم نماز گزارتا ہے انے روزے راکھتا ہے انے تسبی (۶) کرتا ہے انے ملولوں (۷) کو پوچھیا ہے انے درویشوں کو کھاان (۸) دیتا ہے۔ انے جے (۹) کچھو (۱۰) اُس پاس آوتا ہے سو محتاجوں کو بانٹ دیتا ہے انے اپیں نہیں کھاتا۔ انے کدھیں اُس تھیں کوئی رنجیدہ نہیں ہووا۔ انیں پیچھیں جب اے صفتاں ملکیں سنیاں تب کہیا کہ اے باتاں نہوویں کسی منے مگر پیغامبروں منے ہوویں یا پیغامبروں کے پنگڑوں (۱۱) منے ہوویں۔ انے دوجیا یہ پوچھیا کہ یوسف کی تتبع بھاکسی منے کون کرتا ہے، انے اُس پاس کسی پاس تھیں کچھ آوتا ہے پیچھیں انھوں نے کہیا کہ عزیز کی بیر (۱۲) چھپا کر نے بھیجی ولیکن وے قبول نہیں کرتا انے وے پانچ بیراں دوجیاں کوئی ہیں وے بھی بھیجیاں ہیں انھوں کا بھی کچھو قبول نہیں کرتا۔ انے انھوں کا بول بھی نہیں سنتا"

اس تفسیر میں جگہ جگہ گجراتی لفظ آئے ہیں، اس پر سے یہ قیاس کرنا بالکل بجا ہے کہ یہ گجراتی اردو میں ہے اور اس کا مؤلف گجرات کا رہنے والا تھا۔ اس نوع کی اور بھی کتابیں پائی جاتی ہیں جن کے مولف گجرات کے باشندے ہیں۔ یہاں اس تفسیر کے چند گجراتی لفظ معنوں کے ساتھ مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

انے (اور)، بتی (سے، میں)، اتلیک (تھوڑا)، ہمیں (اب)، ہوں (میں)، ڈوسی (بڑھیا)، جمنا (دایاں)، بیر (عورت)، وغیرہ

---

(۱) اور (۲) تمام (۳) اور (۴) نزدیک (۵) لاؤ (۶) تسبیح (۷) غم زدوں (۸) کھانا (۹) جو (۱۰) کچھ (۱۱) اولاد (۱۲) عورت

دکنی ترجمے کا ایک نسخہ ایسا ملا ہے جو اول و آخر سے ناقص ہے۔ اس میں قرآن شریف کے آخری پارے کی سورتوں کا ترجمہ ٹھیٹ دکنی میں کیا گیا ہے۔ زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ بہت قدیم ہے اور دسویں صدی کے اوائل کا ہے اس میں ترجمے کے ساتھ کہیں کہیں مختصر تفسیر سی بھی ہے۔ نمونے کے طور پر سورۃ البینہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لم یکن الذین کفروا من اہل الکتاب والمشرکین منفکین حتیٰ تاتیہم البینہ۔ رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمہ۔ وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءتہم البینہ۔ وما امروا الا لیعبد اللہ مخلصین لہ الدین۔ حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویوءتوا الزکوٰۃ ذالک دین القیمہ۔ ان الذین کفروا من اہل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم خالدین فیہا اولئک ہم شر البریہ۔ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک ہم خیر البریہ۔ جزاؤہم عند ربہم جنات عدن تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ابدا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذالک لمن خشی ربہ۔

ترجمہ

"انہی ولوکاں جو کفر کیے کتاب کے لوکاں لتے ہور شرک کرنہاریاں لتے کنارے ہونہارے نہتے کفر تے تو لگ جو آئی اونوں کوں روشن حجتہ۔ سو ہجب (۱) ہے خدانے پڑتا ہے صحیفاں کوں جو پاک ہیں جھوٹ تے۔ اوس میں لکھی تھی نیٹ باٹ (۲) ہور نیں تفرقا ہوے وو لوکاں جنوں کردیے گیا تھا کتاب مگر روشن حجتہ کے آئے پیچھیں تے۔ ہور اونوں کوں تو نیں حکم کی کیا تھا مگر یو کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کوں نچھل عبادت اوسیچ کوں کرنہارے۔ کفر کا دین چھوڑ اسلام کے دین میں آکہ ہور یو کہ کھڑی کریں فرض نماز کوں اس کے وخت (۳) میں ہور

---

(۱) غالباً "صاحب" ہے (۲) سدھا رستہ (صراط مستقیم) (۳) وقت

یوکہ دیویں مال کے فرض زکوٰۃ کوں ہور و دین نیٹ (۱) ہے۔ تحقیق دو لوکاں جو کفر کیئے کتاب کے لوکاں سے ہور شرک کرنہاریاں سے (اوس کی عبادت میں) جہنم کی آگ میں اچھیں گے (۲) قیامت کے دلیس (۳) ہمیشہ اچھیں گے اوس جہنم میں وو لوکاں انوچ (۴) بہوتیچ (۵) بورے (۶) لوکاں ہیں ساری پیدائش میں ہور نیک عمل کے خالص خدا کے واستے (۷) وو لوکاں انوچ بہوتیچ خوب لوکاں ہیں ساری پیدائش میں۔ جزا انوں کی اُنو کے پالنہارے کنیں ہے۔ باغاں دائم کی بہتے ہیں انوں کے تلار (۸) سے کالوے (۹) دائم اچھینگے اس باغاں میں ہمیشہ اچھناں جسے نہایت نیں۔ خشال (۱۰) ہور اللہ تعالیٰ اونوں سے ہور اونوں خشال ہوے اوس سے۔ وو خشالی اوسیچ کوں (۱۱) ہے جو ڈرتا ہے اپنے پالنہار کے عذاب کوں۔ عبادت کرکر۔"

اس کتاب کی قدامت اس کی زبان سے ثابت ہے بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے استعمال کیئے گئے ہیں جو بعد کے زمانے کی کتابوں میں نہیں پائے جاتے اور اسلوب بیان بھی قدیم ہے مثلاً "کالفراش المبثوث" کا ترجمہ کیا ہے "بتنگ سری کی جھیلی کے"۔ یہ ٹھیٹ پُرانی زبان ہے۔ جھیل یا جھیلی ہجوم اور قطار کو کہتے ہیں۔ اسی طرح "فمن یعمل مثقال ذرۃ" کا ترجمہ کیا ہے "پس جکوئی کہ عمل کرے گا ذرے کے بہار یعنی لال چیٹی کے بہار یا ذرہ دہلارے کا"۔ "دھلارا" کے معنے گرد وغبار کے ہیں۔ الفاظ بھی ایسے استعمال کیئے ہیں جو اسوقت بہت غریب معلوم ہوتے ہیں اور بعد کی دکنی کتابوں میں نہیں آتے۔ مثلاً "بلکی" بمعنی مصیبت یا آفت۔ "کدن" بمعنے طرف۔ تلار یا "تاری" تلے یا نیچے کے معنوں میں۔ ایک لفظ جو اس کتاب میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے وہ "بجاں" ہے۔ مثلاً "بجاں بلوایا" یا "بجاں پوچھیا"۔ بہت غور کے بعد سمجھ میں کہ یہ "بزاں" کی

---

(۱) مستقیم (۲) رہینگے (۳) دن (۴) وہ (۵) بہت ہی (۶) برے (۷) واسطے (۸) نیچے (۹) نہر، ندی (۱۰) خوش حال (۱۱) اُسی کو

خرابی ہے۔ جو اکثر پرانی دکنی کتابوں میں آیا ہے اور "بزاں" بگاڑ ہے "بوازاں" کا الفاظ کا ہجا بھی عجیب ہے یعنی جیسے اس وقت بولتے تھے بجنسہ ویسے ہی لکھ دئے ہیں۔ مثلاً خشتال (خوش حال)، بادزاں (بعدازاں)، شات (شہد) امنا (منع)، بازے (بعضے)، جما (جمع)، ہوذ (حوض) وغیرہ وغیرہ

دکنی میں سورۂ یوسف، پارۂ عم اور سورۂ رحمٰن کے متعدد ترجمے اور تفسیریں پائی جاتی ہیں۔ مجھے سورۂ رحمٰن کا ایک مقفیٰ ترجمہ بھی ملا ہے۔ ترجمے کا نمونہ یہ ہے

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان۔

(ترجمہ) اے لوگوں تم کرو بکھاں جس کا میٹھا نام رحمان، جن سکھایا ہے قرآن، جن سرجا ہے انسان۔

الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان

(ترجمہ) سکھایا تم کو سبھی بیان چاند سورج سوں حساب پچھان جھاڑ پیڑ بھی نمیں[۱] سبحان، سجدا کریں ہیں اوس کوں مان۔

والسماء رفعہا ووضع المیزان الا تطغوا فی المیزان

(ترجمہ) اونچا کیتا اُن اسمان، راکھے ہیگی اُن میزان، اپنے دل سوں حق پچھان، کم زیادہ منہ کر جان۔

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان

(ترجمہ) جو تول سو پورا تول، جو مول نو سو پورا مول، ڈنڈی دانبے یچ جھول، دغل نہ کیجو قول البول۔

والارض وضعہا للانام فیہا فاکہتہ والنخل ذات الاکمام والحب ذو العصف والریحان۔

(ترجمہ) لوگوں کا جیں[۲] زمین بچھائے، میوہ خرما جھاڑ اگائے، داوہ[۳] پیدا کر بکھلائے،

۱۔ جھکنا ۲۔ لئے ۳۔ کاتب کی غلطی ہے، دانہ ہونا چاہئے۔

ادس میں اگل[1] ریحان کہلائے۔

فبای الآء ربکما تکذبان

تم پر رب کا اتنا مان، کس نعمت تم ہوے اجان۔

تفسیر حسینی کا ترجمہ بھی کسی صاحب نے پرانی دکنی میں کیا ہے۔ یہ تفسیر بہت مقبول ہے اور اس کے متعدد ترجمے دکنی زبان میں ہوئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت پارۂ عم کی تفسیر کا ترجمہ موجود ہے، اس کی زبان پرانی ہے۔ آخر میں کاتب نے دن، وقت اور تاریخ (روز جمعہ بوقت عصر دو ماہ جمادی الآخر) تو لکھی ہے لیکن سنہ نہیں لکھا۔ چند آیتوں کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ تفسیری جملے بھی ہیں۔

(عم یتساءلون) کس چیز تے پوچھتے ہیں او کافراں یعنے مکی کافراں یعنے بعث نے پوچھتے ہیں آپس میں آے یا رسول کون ہور موناں کوں (عن النباء العظیم) بزرگ خبر تے (الذی ھم فیہ مختلفون) ایسی خبر کہ انو اس میں اختلاف کرنہارے ہیں۔ (کلا سیعلمون) یوں نہیں یو نچتا ہے کہ انکار کریں ترت ہے کہ سمجھیں گے اونو کوں، یو ڈرانے کا وعدہ ہے (ثم کلا سیعلمون) پچھیں یوں نہیں پونچتا ہے ترت ہے کہ سمجھیں اونو، دوبار لیا یا ایسے تاکید کے واستے ہور "ثم" سوں لیا نا سمجھیا کر دیتا ہے یو کہ دوسرا وعدا بہت سخت ہے ہور بعضے بولے پہلا[2] سو جیو کا پڑتے وقت ہور دوسرا سو جزا کے وقت (الم نجعل الارض مھادا) آیا نہیں کئے ہمیں زمین گنوارا[3] جوں ہنواداں[4] کا ہے۔ یو ذکر کرتا ہے تھوڑیاں باتاں کوں جو دیکھتے ہیں او خدا کے عجائب صفت تے یو اونو کوں سمجھانے کے واستے اس کی کمال قدرت پر دلیل پکڑیں اس سے بعث کے دوست ہونے پر (والجبال اوتادا) بولتا اللہ تعالیٰ آیا نہیں کیے ہمیں ڈونگراں[5] کو میخاں زمیں کیاں یوں نہ ہوتے تو ہلتی (وخلقناکم ازواجا) ہور کیا نہیں پیدا کئے ہمیں تمنا جوڑی جوڑی مرد عورت (وجعلنا نومکم سباتا) ہور کیا

---

[1] اعلیٰ درجے کے [2] پہلا [3] گہوارہ [4] بچوں [5] پہاڑوں

ہنیں پیدا کئے ہمیں تمارے سونے کوں توڑنا دیکھنے لے ہور ہلنے لے تمنا راحت ہور آسودہ ہونے کے واستے (وجعلنا اللیل لباسا) ہور کیا ہنیں کئے ہمیں رات کوں پینناد (۱)۔ اوہاں (۲) پینی ہے اپنے اندھارے سوں جونکہ کپڑا ڈھانکتا ہے اپنے انگ کوں (وجعلنا النہار معاشا) ہور کیا ہنیں کئے ہمیں دلیس (۳) کوں زندگانی (۴) بدل (۵) تا طلب کریں تمیں زندگانی سیانکو جونکہ کھانا پنیا کپڑا (وبنینا فوقکم سبعاً شدادا) ہور کیا ہنیں بنا کیا کیے ہمیں تمارے اوپر سات آسماناں گھٹ (۶) کہ ہنیں پورانیاں ہوتیاں لئی (۷) زمانے جانے سوں"

تفسیر تنزیل کے نام سے قرآن پاک کی ایک تفسیر سید بابا قادری نے سنہ ۱۱۴۷ھ میں لکھی۔ کتاب کے اختتام پر مولف نے خود اس کی تصریح کردی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے ــــ

"خدائے تعالیٰ نے جیساکہ اس سورے (ناس) کے تئیں پانچ ناس پر تمام کیا اسی طرح اس تفسیر تنزیل کو بھی پانچ شخصوں پر تمام کیا۔ اول یہ تفسیر یعنی مصنف سید بابا قادری دوم حاجی میاں محمد علی سیوم محمد عبدالغفور خاں یہ دونوں اس امر میں بہت کوشش رکھتے تھے۔ چہارم محمد مسافر جوان صالح اور لائق خوش مزاج اور خوش نویس اور پنجم محمد واجد علی کہ یہ دو شخص تصنیف کے لکھنے والے تھے کہ خدائے تعالیٰ ان دو شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام کروایا۔

خدائے تعالیٰ قرآن شریف کے تئیں حرف بے سے شروع کیا اور ختم قرآن کا حرف سین پر ہوا۔ ان دو حرفوں کے تئیں مرکب کرو تو لفظ بس کا حاصل ہوتا ہے یعنی ان دونوں حرفوں کے بیچ میں جو تمام قرآن ہے بس کرتا ہے تیرے تئیں۔

(فرد) اول و آخر قرآن زچہ با آمد و سین یعنی اندر رہ دیں رہبر تو قرآن بس اور تصنیف بھی تفسیر کی پانچ سال میں تمام ہوئی کس واسطے کہ سن چالیس میں شروع

---

(۱) پہننا (۲) وہاں (۳) دن (۴) معاش (۵) واسطے (۶) محکم (۷) بہت

ہوئی اور سن سینتالیس میں تمام ہوئی، دو سال کامل ناغہ ہوئے۔ تمام شد تفسیر تنزیل بتاریخ بیست و پنجم شہر ذی قعدہ در سن یک ہزار یک صد و چہل و ہفت ہجر النبوی۔

اس کتاب کی زبان صاف ہے اور بارہویں صدی کے وسط کی زبان کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ زبان سے بظاہر قیاس کرنا مشکل ہے کہ مصنف کس مقام کا ہے۔ چونکہ ایک آدھ لفظ کہیں کہیں دکنی کا آگیا ہے اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ دکن کا باشندہ ہے۔ تھوڑا سا ترجمے کا نمونہ یہاں دیا جاتا ہے۔

(فتحنا علیہم ابواب کل شئے) کھول دیا ہم نے ان کے اوپر دروازہ ہر شئے کا جو ان کو چاہا سو ملا۔ (حتیٰ اذا فرحوا بما اوتو) تب تیں کہ وو خوش ہوئے اوس چیز سیں کہ دی گئی۔ (اخذنا ہم بغتتہ) پکڑے ہم نے اوس کو یکایک۔ (فاذا ہم مبلسون) پس یکایک وہ پشیمان اور نا امید ہووے (فقطع دابر القوم الذی ظلموا) پس کاٹا گیا آخر اوس جماعت کا جنوں نے ظلم کیا تھا (والحمد للہ رب العالمین) اور حمد خدا کوں ہے جو پرودگار عالم کا ہے۔ (قل ارایتم ان اخذ اللہ سمعکم وابصارکم وختم علیٰ قلوبکم من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بہ) کہو کہ دیکھتے ہو تم کہ اگر لیویں خدا تمہارے سننے کو یعنی بہرہ کرے اور لیوے تمہاری آنکھوں کوں کہ اندھا کرے اور ٹہرا[1] کرے اوپر تمہارے دلوں کے کہ بے شعور کرے تو کون سا خدا ہے بغیر اوس کے کہ وو دیوے تم کوں یہ جو دیا ہے (انظر کیف نصرف الآیات) دیکھو تم کہ کیسیاں پھیرتے ہیں ہم آیتوں کوں اون کے سمجھانے کے واسطے (ثم ہم یصدفون) پیچھے نہیں مانتے ہیں اور موں پھیرتے ہیں (قل ارایتکم ان اتاکم عذاب اللہ بغتتہ او جہرۃ) کہو کہ کیا دیکھتے ہو تم گر آوے تمہارے پاس عذاب خدا کا یکایک یا ظاہر ہوے اوس کی علامت (ہل یہلک القوم الظالمون) نہ ہلاک کئے جائیں گے اوس وقت منے قوم ظالموں کا۔ (وما نرسل المرسلین) اور نہیں بھیجے ہم نے پیغمبروں کیلئے (الا مبشرین و منذرین) مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے۔

---

[1] غالباً کاتب کی غلطی ہے۔ "مہر کرے" ہونا چاہئے۔

اِس عبارت میں صرف "منے" کا لفظ ایسا آیا جو دکنی ہے ورنہ باقی ساری عبارت ایسی ہے جس میں شمال وجنوب کی زبان کا مطلق کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ پوری تفسیر اسی زبان میں ہے۔

پارۂ عم کی ایک تفسیر اور ہے۔ اس کا نام "خدا کی نعمت" معروف "مرادیہ" ہے اس کے مصنف شاہ مراد اللہ سنبھلی ہیں۔ اور سنہ تصنیف ۱۱۸۴ ہجری ہے چنانچہ خاتمۂ کتاب میں مصنف نے ان سب امور کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

"حمد اور شکر کا سجدہ لائق ہے سزاوار ہے پاک پروردگار کے تئیں جس خاوند نے اپنے فضل وکرم سے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عم سپارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کروادی اور اس عاصی گنہگار مراد اللہ انصاری سنبلی قادری نقشبندی حنفی کو یہ خدمت فرما کر توفیق بخش کر یہ خیر کام پورا کر دیا اور پھر اس تفسیر کا نام "خدا کی نعمت" مقرر کروایا۔ یہ تفسیر محرم کے مہینے کی چوبیس تاریخ جمعے کے دن اگیارہ سو چوراسی برس ہجری تمام ہو کر پچاسی شروع ہوا تھا جو تمام ہوئی۔"

یہ بڑی تقطیع کے ۳۰۲ صفحوں پر ہے اور شہر ربیع الاول سنہ ۱۲۶۰ ہجری میں نستعلیق ٹائپ میں طبع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس سے قبل چھپی تھی چنانچہ ناشر کتاب نے خاتمۂ طبع میں یہ عبارت لکھی ہے۔

"خاکسار سید عبداللہ ولد سید بہادر علی عفا اللہ عنہا نے صرف بہ نیت اِس کے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت کی جزا دیوے اور شاہ مراد اللہ رحمۃ کی روح مجھ سے خوش ہو جاوے اس کتاب کی تصحیح کر کے چھپوایا اور غلطیوں کو دُور کیا جس کو باور نہ ہو تو اگلے چھاپے کی کتاب سے مقابلہ کر کے دیکھے اور انصاف کرے۔"

تفسیر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ متروک الفاظ خال خال ہیں اور وہ بھی بہت معمولی۔ مثلاً ہے (بجائے یہ) وے (بجائے وہ)' اوپر (بجائے پر)' ہووے (بجائے ہو)' اندھیاری (بجائے اندھیرا) آن نے (بجائے اُس نے) اور یہ اور اسی قسم کے اور لفظ ہیں جو اب بھی بعض مقامات پر بول چال میں آتے ہیں۔ جملوں کی ساخت البتہ کسی قدر

پُرانی ہے۔ اِس سے قبل جن کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ برائے نام تفسیریں ہیں، در حقیقت ترجمے ہیں۔ تفسیر کی غرض سے کہیں کہیں ایک آدھ جملہ بڑھا دیا گیا ہے لیکن اس کتاب میں تفسیر شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہے۔ اِس کتاب کی زبان بارھویں صدی کے اواخر کی زبان کا اچھا نمونہ ہے۔ اُس کی ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے اُس کی زبان اور جملوں کی ساخت وغیرہ کا اندازہ ہوگا۔

(ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ) اور مقرر شتاب عطا کرے گا دیوے گا بخشے گا تجکو یا محمد پاک پروردگار تیرا پھر راضی ہو ویگا تو دے وے نعمتیں خوبیاں بخشے گا تجکو یا محمد پیدا کرنے والا تیرا آخرت میں جو تو خوش ہو جاوے گا۔ سب طرح کی فکریں جاتی رہیں گی تمام عالم کی شفاعت کا درجہ، مقام محمود۔ تمام امت کی شفاعت کا حکم، بہشت کی بڑی بڑی نعمتیں، بے حد بے نہایت، ہمیشہ کا دیدار، ایسی بڑی خوبیاں تیرے واسطے رکھی ہیں۔ خاطر کو خوش رکھ، اُن کافروں مشرکوں کے طعنے مارنے میں غمگین ناخوش مت ہو کوئی دن میں بے سبب باتیں جاتی رہیں گی۔ تم کو خوشی ہمیشہ رہے گی۔ روایت ہے جب یہ آیت نازل ہوئی حضرت رسول (ع م) خوش ہوئے اور فرمایا میں ایک آدمی کی بھی میری امت کے دوزخ میں رہنے کا راضی نہیں ہونے کا، یہ بات امت کے واسطے بڑی خوشخبری ہے۔ تھوڑے سے بہتایت ہے، پہلے حال سے آخر کا حال بہتر ہے، دنیا سے آخرت بہتر ہے۔"

ہندوستان کے نامور محدث اور عالم شاہ ولی اللہ (رح) دہلوی اور ان کے خاندان نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کا فیض سارے ملک کو پہنچا ہے۔ شاہ ولی اللہ (رح) نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں سنہ ۱۱۵۰ھ میں کیا جو بڑی خوبیوں کا ہے۔ ان کے فرزندوں میں سے مولانا شاہ رفیع الدین (متوفیٰ سنہ ۱۲۴۹ھ) اور مولانا شاہ عبدالقادر (متوفیٰ سنہ ۱۲۴۲ھ) نے اردو زبان میں ترجمے کیئے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بہت مقبول اور مشہور ہوا اور اب تک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ٹھیٹ اردو میں ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ

کے لئے ہندی یا اُردو کے ایسے برجستہ اور برمحل الفاظ ڈھونڈھ کے نکالے ہیں کہ اُن سے بہتر ملنا ممکن نہیں۔ ترجمے کی زبان کے متعلق خود شاہ صاحب نے اپنے دیباچے میں صراحت فرمادی ہے۔

• اب کئی باتیں معلوم رکھئے۔ اوّل یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنے مفہوم نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس زبان میں ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

شاہ صاحب نے یہاں ریختے اور ہندی متعارف میں جو فرق کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ ہندی متعارف سے وہی زبان مراد ہے جسے آج کل ہندوستانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس ترجمے کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں

یہ ترجمہ سنہ ۱۲۰۵ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں ہوا۔ یہ سنہ بھی خود شاہ صاحب کا بتایا ہوا ہے۔ وہ دیباچے میں فرماتے ہیں "اس کتاب کا نام موضح القرآن ہے اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے"

شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے کا سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہوا جن لوگوں نے اپنی کتابوں میں اس ترجمے کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی نے بھی اس کا سنہ نہیں لکھا مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے اِس ترجمے کے ایسے الفاظ کی ایک فرہنگ شائع کی تھی جو آج کل استعمال میں نہیں آتے۔ اس کے دیباچے میں وہ اِس ترجمے کا سنہ ۱۲۲۲ھ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کی صراحت نہیں کی یہ سنہ انھوں کہاں سے تحقیق کیا۔ ایسی صورت میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سنہ درست ہے۔ عام طور پر مصنفین نے اس خیال سے کہ یہ شاہ عبدالقادر سے عمر میں بڑے تھے ان کے ترجمے کو زمانے کے لحاظ سے مقدم رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی محض قیاس ہے اور جب تک کوئی قطعی ثبوت نہ ملے اس کی صحت مشتبہ ہے۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بعد کا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمے کے

دیباچے میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے کا ذکر تو کیا ہے لیکن اپنے بھائی کے ترجمے کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ اِس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اُس وقت تک انھوں نے کوئی ترجمہ نہیں کیا تھا۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ پہلی بار کلکتہ کے اسلام پریس میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد سنہ ۱۲۵۴ھ میں اور دوسری جلد اس کے دو برس بعد شائع ہوئی۔ اس اڈیشن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ متن قرآن کے نیچے اُردو ترجمہ نستعلیق ٹائپ میں ہے۔

یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں لیکن شاہ رفیع الدین نے ترجمے میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے۔ ایک حرف اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے پایا۔ ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اردو زبان کے محاورے کھپے یا نہ کھپے انھیں کرنا ضرور ہے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حُسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اُردو زبان کے روزمرے اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری خوبی ان کے ترجمے میں ایجاز کی ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاںتک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے۔

ان دونوں ترجموں کا فرق ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

شاہ رفیع الدین :۔ شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے

شاہ عبدالقادر :۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا۔

اگرچہ شاہ عبدالقادر نے جملے میں فعل نہیں لکھا کیونکہ اصل عربی میں بھی نہیں اور شاہ رفیع الدین نے فعل ترجمے کی خاطر داخل کیا ہے۔ تاہم شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ سلیس اور صاف اور صحیح ہے اور اصل عربی الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔

اب پارۂ الم کی ابتدائی آیتوں کے ترجمے دونوں ترجموں سے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین

یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے
راہ دکھلاتی ہے واسطے پرہیزگاروں کے
وہ لوگ کہ ایمان لائے ساتھ غیب کے یعنی
بن دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز کو
اور اس چیز سے کہ دیا ہے ہم نے ان کو خرچ
کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے
ہیں ساتھ اس چیز کے جو اُتاری گئی ہے طرف
تیری اور جو اُتاری گئی ہے پہلے تجھ سے
اور ساتھ آخرت کے وے یقین رکھتے ہیں
یہ لوگ اوپر ہدایت کے ہیں پروردگار
اپنے سے اور یہ لوگ وہی ہیں چھٹکارا
پانے والے۔ تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے
برابر ہے اون کے کیا ڈرایا تو نے ان
کو یا نہ ڈرایا تو نے ان کو نہ ایمان لاویں
گے۔ مہر کی ہے اللہ نے اوپر دلوں انکے
کے اوپر کانوں ان کے کے اور اوپر آنکھوں
ان کی کے پردہ ہے اور واسطے ان کے
عذاب ہے بڑا۔

شاہ عبدالقادر

اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ راہ
بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں
بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز
اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اور جو
یقین کرتے جو کچھ اترا تجھ پر اور جو اُترا
تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے
ہیں۔ انھوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی
اور وہی مراد کو پہنچے وہ جو منکر ہوئے
برابر ہے ان کو تو ڈراوے یا نہ ڈراوے
وہ نہ مانیں گے۔ مہر کردی اللہ نے اون کے
دل پر اور اون کے کان پر اور ان کی
آنکھوں پر ہے پردہ۔ اور اون کو بڑی
مار ہے۔

دونوں ترجموں کے مقابلے سے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کی فوقیت ظاہر ہے اوّل تو اس میں ایجاز ہے یعنی بلا وجہ کوئی لفظ اپنی طرف سے داخل نہیں کیا۔ دوسرے اُردو روزمرہ اور جملوں کی ساخت کا خیال رکھا ہے تیسرے (جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے) ترجمہ ریختے میں نہیں بلکہ "ہندی متعارف" یعنی ہندوستانی

میں کیا ہے۔ ان وجوہ سے ترجمہ زیادہ سلیس اور صحیح ہے۔ مثلاً متقین کا ترجمہ بجائے پرہیزگاروں کے "ڈر والوں" کیا ہے۔ یقیمون الصلوٰۃ کا ترجمہ "درست کرتے ہیں نماز" کیا ہے۔ مفلحون کا ترجمہ "وہی مراد کو پہنچے کیا گیا ہے۔ شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ "چھٹکارا پانے والے" کیا ہے اگرچہ یہ لفظ ہندی ہے لیکن شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ صحیح اور اصل سے قریب تر ہے اور اس سے اصل مفہوم بہتر طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ رہی جملوں کی ترکیب سو دونوں ترجمے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے اس کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ دوسرے ترجمے کے مقابلے میں اسقدر بہتر اور افضل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہوتے چندسال بعد دوسرے ترجمے کی ضرورت کیوں سمجھی گئی۔

اسی زمانے (۱۲۰۶ھ) میں ایک تفسیر مع ترجمہ لکھی گئی جس کا نام تفسیر قرآنی موسومہ حقانی ہے۔ اس کا ذکر جناب احسن صاحب مارہروی نے اپنی تاریخ نثر اردو میں کیا ہے۔ اس کے مولف سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہروی ہیں۔ ترجمے کے ساتھ مختصر تفسیر بھی ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے

نمونۂ ترجمہ آیت آخر سورۂ بقر پارہ ۳

رنج میں نہ ڈالے گا خدا تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت اس کی کے۔ اُس کو ہے جو عمل کیا اور اوپر اُس کے جو گناہ کیا۔ اے پروردگار میرے عذاب مت پکڑ تو مجھ پر جو بھول جاؤں میں یا خطا کروں میں۔ اے پروردگار میرے، اور بوجھ مت دے تو اوپر میرے بوجھ بھاری، جیسے بوجھ رکھا تو نے اُوپر اُس گروہ کے کہ پہلے تھے مجھ سے۔ اے پروردگار میرے اور مت رکھ اوپر سر میرے کے بوجھ جو کہ نہ اُٹھا سکوں میں اور در گزر کر خطاؤں میری سے اور بخش تو گناہوں میرے کو اور رحم کر تو اوپر میرے۔ تو ہے خاوند میرا، پھر غالب کر تو مجھکو اوپر قوم کافروں کے۔[1]

---

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۸۲

شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں قرآن پاک کے کئی ترجمے ہوئے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمے بھی اُسی زمانے کے ہیں ایک اور ترجمہ جو بادشاہ کے ایما سے ہوا وہ دلی کے نامور طبیب حکیم محمد شریف خاں مرحوم کا کیا ہوا ہے۔ یہ ترجمہ (قلمی) ہے اس وقت حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے ہمیں اس کی زیارت نصیب ہوئی۔ فاضل مترجم نے ترجمہ کے آخر میں جو عبارت تحریر کی ہے اس ترجمے کی کیفیت معلوم ہوگی ــــ وہ عبارت یہ ہے۔

"للہ الحمد والمنتہ کہ ایں تفسیر سلاست تحریر حسب الامر ارفع اشرف اعلیٰ بادشاہ جمجاہ دیں پناہ السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان اسد المعارک والمغازی جلال الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ ذرۂ خاکسار بے مقدار حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خان مرحوم شروع در تسوید و تحریر آں نمودہ بود، بمساعدت توفیق الٰہی و معاضدت اقبال شہنشاہی در نیکوترین ازمنہ و بہترین ادنہ زیب و زینت اختتام پذیر رفت۔ الحمد اللہ الذی بتوفیقہ تمت ہذا التفسیر یوم الجمعہ فی التاسع من ذی القعدہ بید الحقیر محمد بدرالدین مفوض اللہ بن فیض اللہ۔۔۔" گویا افسوس کا دن ہے کہ اختتام تفسیر کا دن او تاریخ موجود ہے لیکن سنہ ندارد۔ حکیم صاحب کا انتقال جیسا کہ حکیم محمد احمد خاں صاحب کی زبانی معلوم ہوا ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں ہوا اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ اس سے قبل کا ہوگا۔ حکیم صاحب اسے تفسیر کہتے ہیں لیکن درحقیقت ترجمہ ہے البتہ موقع سے کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ترجمے کی صراحت کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ جیسا کہ نمونے سے معلوم ہوگا۔

الم کی ابتدائی آیات کا ترجمہ:۔ اس کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح ہندی میں نہیں بلکہ ریختے میں ترجمہ کیا ہے۔

میں ہوں اللہ بہت جاننے والا۔ وہ کتاب کہ اگلی کتابوں میں وعدہ اتارنے

کا تھا۔ یہ کتاب کامل ہے لیعنی قرآن کہ کچھ شبہ نہیں ہے بیچ اوس کے اللہ کی طرف سے آنے میں۔ راہ دکھانے والی ہے پرہیزگاروں کو شرک سے اور گناہوں سے۔ وہ پرہیزگار کہ ایمان لاتے ہیں بغیر دیکھے کہ اللہ موجود ہے یا ساتھ وحی کے اور قیامت کے یا قضا و قدر کے اور قائم رکھتے ہیں نماز پانچ وقت کی کو ساتھ شرطوں اور ادب کے اور جس چیز سے کہ روزی دی ہے ہم نے ان کو خرچ کرتے ہیں اوپر عیال کے اور فقیروں کے۔"

(اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پناہ پکڑتا ہوں میں اور التجا کرتا ہوں میں ساتھ اللہ کے بدی شیطان وسواس دلانے والے کی سے کہ دور رحمت سے ہے اور نکالا گیا بہشت سے (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) شروع کرتا ہوں میں قرآن کو ساتھ نام اللہ لائق بندگی کے بہت بخشنے والا اوپر خلق کے وجود دینے سے دنیاں میں مہربان ہے اوپر اون کے آخرت میں۔

(ترجمۂ سورۂ فاتحہ)

جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کو، بخشنے والا وجود کا آخرت میں، مہربان داخل کرنے بہشت کے سے۔ مالک دن قیامت کے کا، تصرف کرنے والا اوس دن جو چاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں اوپر بندگی تیری کے دکھا تو ہم کو راہ سیدھی بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے، راہ اون آدمیوں کی۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ۱؎ اور نہ راہ گمراہوں کی۔

(سورۂ یونس کی چند ابتدائی آیات کا ترجمہ)

میں ہوں اللہ کہ دیکھتا ہوں سب چیز کو۔ یہ آیتیں قرآن با حکمت کی ہیں یا محکم ہیں متشابہ نہیں۔ آیا ہے واسطے آدمیوں کے تعجب یہ کہ وحی کی ہم نے طرف ایک مرد کے

۱؎ اس مقام سے چند لفظ مٹ گئے ہیں۔

اونھیں کی جنس سے یہ کہ ڈرا تو آدمیوں کو عذاب اللہ کے سے ورخوش خبری دے تو اون لوگوں کو کہ ایمان لائے ہیں یہ کہ واسطے اون کے آگے آنا یا رضا (خوشی) خدا کی۔"

شاہ عالم بادشاہ ہی کے عہد میں ایک اور ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی سرپرستی میں ہوا۔ بعض وجوہ سے یہ ترجمہ چھپ کر شائع نہیں ہونے پایا۔ اس کے سرِورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"ترجمۂ قرآن شریف بزبان ہندی

اس کے شروع کی تاریخ موافق سنہ ہجری کے تمام اس مصرع سے نکلتی ہے۔

صراط المستقیم الحق ہے بالکل (۱۲۱۸)

ترجمہ قرآن شریف کا ہند کے اہلِ اسلام کی خاطر سلطنت میں ظلِ سبحانی شاہ شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ اور حکومت میں زبدۂ نوآئینان عظیم الشان مشیرِ خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے حسب الحکم صاحب والاقدر عالیشان مدرس تفریق ..... جان گلکرسٹ صاحب دام حشمتہ کے کیا اور ابتدا سے انتہا تک جو جو احوال گذرا ہے خاتمے میں لکھا۔ اس کے مطالعہ کرنے سے تمام حقیقت معلوم ہوگی۔"

جہانتک اُردو زبان کی ساخت اور ترکیب کا تعلق ہے یہ ترجمہ پہلے کے تمام ترجموں کے مقابلے میں زیادہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ اگرچہ الفاظ کی رعایت مدِنظر رکھی ہے کیوں کہ ایسے صحیفوں کے ترجمے میں اس کے بغیر چارہ نہیں، تاہم حتی الامکان اُردو کے روزمرہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جملے کی ترکیب عربی کے نہج پر نہیں بلکہ اُردو کے ڈھنگ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ بغیر کسی دقت کے صاف صاف سمجھ میں آتا ہے۔

کاظم علی جواں جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے اور جن کی تصنیف سے کئی کتابیں ہیں، اس ترجمے کی زبان کی اصلاح و درستی پر مامور تھے۔ انھوں نے آخر میں ایک خاتمہ لکھا ہے جس سے اس ترجمے کے آغاز و انجام اور اہتمام کی پوری

کیفیت معلوم ہوگی۔ خاتمے کی عبارت بجنسہ یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"الحمد للہ والمنتہ کہ ماہ مبارک رمضان کی نویں تاریخ سنہ ۱۲۱۹ بارہ سے اُنیس ہجری میں پنجشنبے کے روز ظہر کے اوّل وقت قرآن شریف کا ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا۔ شروع اس کی حسب الحکم صاحب عالیشان جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ کے ذالحجہ میں کہ سن بارہ سے سترہ تھے ہوئی تھی۔ مولوی امانت اللہ صاحب اور میر بہادر علی صاحب میر منشی اور احقر ترجمے اور محاورے کے لئے مقرر تھے اور چندے مولوی فضل اللہ کو بھی ارشاد حضور ہوا کہ تم بھی شریک ہو کہ بدون دو مولویوں کے یہ امر عظیم ترجمے کا بخوبی سرانجام نہ ہوسکے گا۔ چنانچہ نام ان کا شروع میں مندرج ہے۔ پانچ سیپارے جب ترجمہ ہوئے، ایسی کچھ نزاع لفظی ان دونوں صاحبوں کے درمیان آئی کہ ان میں سے مولوی فضل اللہ صاحب رہے اور دوسرے صاحب کے عوض حافظ غوث علی صاحب مقرر ہوئے۔ یے دونوں بدستور ترجمہ کرتے تھے جب صاحب ممدوح ذیقعد کی دسویں تاریخ سن بارہ سے اُنیس (۲۲ فروری سنہ ۱۸۰۴ء) میں ولایت کو تشریف لے گئے اور اصالتاً مسی کپتان موبٹ صاحب دام حشمتہ کو حضور پر نور سے مقرر ہوئی، اُسی طور سے موافق ان کے ارشاد کے کام ترجمے کا جاری رہا۔ چنانچہ اس عرصہ میں اکیس سیپارے ہوئے تھے کہ صاحب عالیشان نے بندے کو فرمایا مولویوں میں سے ایک مولوی ترجمہ کرے اور تو ہی محاورے کی درستی میں رہ، قبول کرکے مولوی فضل اللہ صاحب ترجمہ کرتے رہے اور بندہ محاورہ کرتا رہا۔ اور اب حق سبحانہ و تعالیٰ کے تفضلات سے وہ کام سرانجام کو پہنچا یا مگر نظر ثانی باقی ہے جس طرح سے ارشاد ہوگا کرنے میں آوے گی۔ لیکن وے لوگ جو ہمیشہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرتے ہیں اُن کی خدمت میں التماس یہ ہے کہ مہربانی سے نگاہ کریں۔ قرآن شریف کہ کلام الٰہی ہے اور فصاحت و بلاغت ایسی کہ چشم و گوش فلک نے بھی نہ دیکھی نہ سُنی اور جس عصر میں کہ اس کا نزول ہوا ہے کیسے کیسے اہل فصاحت و بلاغت عربستان میں تھے، اس کی عبارت جو سراسر مضمون سے بھری ہوئی ہے اور تمام مسجع اور مقفا ہے، نگاہ کرکے حیران تھے۔ بشر کا کیا مقدور

ہے کہ اس کے ایک حرف کی خوبی بیان کرے اور ایک زبان تو کیا اگر تمام روئیں بدن کے زبان گویا ہوں دونوں جہان کی جتنی خلقت ہے تو بھی ذرے کے برابر مدح و ثنا نہ کر سکے۔ الحق کہ کہاں کلام خالق کا اور کہاں زبان مخلوق کی۔ پس جو جو صنائع و بدائع اس میں ہیں من وعن اس کا ترجمہ کس سے ہو سکتا ہے مگر فارسی ترجمے اور تفسیروں سے جس لفظ کے جو معنے مترجموں اور مفسروں نے لکھے ہیں زبان ریختہ میں اُن کے موافق لکھنے میں آیا ہے۔ تفسیر بیضاوی اور مدارک و جلالین تین عربی تفسیریں، بحر مواج اور تفسیر حسینی کہ یہ دو فارسی ہیں اُن سے ترجمہ کیا ہے۔ جہاں کہیں جو کچھ اختلاف سمجھے ان پانچوں تفسیروں میں دیکھ لے۔ ایک نہ ایک میں موافقت پائی جائے گی اور کہیں کہیں جو الفاظ ماضی و حال و استقبال کے ہیں اور مفسروں نے ماضی کو حال اور حال کو استقبال کیا ہے یہاں بھی اسی طریق کی پیروی ہوئی ہے۔ مگر جہاں کہیں زمانے کی مطابقت سے ہندی عبارت کے مطالب میں اختلاف نظر آیا، چار و ناچار بطور محاورے کے رہنے دیا۔ اور اگرچہ لفظ کے ترجمے کی رعایت سراسر رکھی ہے پر کہیں کہیں اصل مطلب لیا ہے کیونکہ لفظ کی متابعت سے معنوں کا فوت ہونا قباحت عظیم ہے، اس بات کو ترجیح دی۔ بہر نوع مطلب نہیں چھوٹا۔ اس لیے محاورے کو چنداں دخل نہیں دیا کہ کتابی عبارت کا داب روزمرے کی بول چال سے اور ہے۔

جزو مقطعات کا ترجمہ جو بالاتفاق نہ پایا نہ کیا۔ اور مفعول مطلق ہندی میں شاذ و نادر ہے کہیں جو رہ سکا تو رکھا والا نہ یا چھوڑ دیا لفظ تاکید زیادہ کیا کہ اس سے تاکید غرض ہے اور عربی میں التفات بہت سا ہے اور ہندی میں کم لیکن وہ قاعدہ رہنے دیا کہ بہت بتکرار ہے۔ واؤ عاطفہ اور حرف فا اور وہ الفاظ کہ معنے میں تحقیق کے آتے ہیں قرآن شریف میں بہت ہیں اور زبان عربی میں فصاحت رکھتے ہیں۔ ہندی میں گو کہ ان کی کثرت محاورے کی رو سے اسقدر نہیں لیکن ترک کرنا ان کا جائز نہ دیکھا، اس سبب سے جس جملے میں جسقدر آئے ترجمہ کیا۔ اور تمام

کلام اللہ قلیل العبارت وکثیر المعنی ہے جتنے اہلِ اسلام کے فرقے ہیں سب کے
دین وایمان کی بنا اسی سے ہے۔ اجتہاد کر کے ہر ایک بنا . . . اصل اصول ہیں
سے راست کرتا ہے اور شانِ نزول ہر ایک آیت کی ہے۔ اگر لکھنے میں آتی تو
عبارت بہت طویل ہو جاتی، اگرچہ بعض جگہ جابجا کچھ بیان کیجئے۔ پہلے جس
صاحب ممدوح کی فرمائش تھی انھوں ارشاد کیا کہ یہ ترجمہ کلام اللہ کا اگرچہ ہندی زبان
میں ہے ہند کے لوگ بخوبی سمجھیں گے تاہم جب تک معلومات بوجہ احسن نہ ہوگی کیوں کر
مطلب کو پہنچیں گے۔ ہر ایک غبی کو کب یہ استعداد ہے کہ کتاب کی عبارت کا بیان کوکہ
اسکی عبارت میں ہو کر سکے۔ یے اہل فہم ذکا کے لئے ہے کہ اگر آپ کماحقہ نہ سمجھ سکے
کسی صاحب استعداد سے دریافت کرے یقین ہے کہ ہیچ کتابیں کہ اس عصر میں عربی و
فارسی سے ہندی ہوئی ہیں اور اُن کے مطلب جس طرح چاہئے ہر ایک بیان نہیں کر سکتا
یہ تو کلام اللہ کا ترجمہ ہے اس کو ہر ایک اس طرح کیونکر سمجھے کہ محتاج کسی استاد کے
پوچھنے کا نہ ہوگا۔ جہاں کہیں کہ عالم و فاضل جس عبارت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جنھوں
کو کم استعداد ہے وے اس کی دریافت میں عاجز ہیں، اُن کی آسانی کے لئے بطور
حاشیہ ایک خط فرضی کر کے مطلب کو بڑھا دیا ہے تاکہ اس نشان سے معلوم ہو کہ
یہ ترجمے سے جو زیادہ ہے ہندی زبان کے ربط کے لئے بڑھا دیا ہے۔ پھر یہ اپنی طرف
سے تصرف نہیں کیا، تفسیروں کی رو سے ہے اور شروع ترجمے میں خلقت نے اس
بات میں بہت سی شورش کی تھی کہ بنا اس ترجمے کی ہوتی ہے نہایت دین وآئین
سے برخلاف ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ ہندی زبان میں ہوتا ہے۔ آخرش جو اہل
فہم اور فراست تھے انھوں نے جواب دیا کہ اگر فارسی میں ترجمہ ہوا ہے تو ہندی میں
کیا کفر ہے۔ غرض کہ فضل الٰہی سے وہ آغاز انجام کو پہنچا۔ حق تعالیٰ انھیں اس کا
بڑا اجر دے جنھوں نے اس کی ابتدا کی اور جنھوں نے انتہا کو پہنچایا۔ اہلِ اسلام
پر ان کا بڑا احسان ہے کہ جب تک کوئی صرف نحو اور منطق ومعقولات اور بہت سے
علوم حاصل نہ کرتا ہرگز کلام اللہ کی عبارت کے معنے دریافت نہ کر سکتا مگر ترجمے جو

فارسی اور فارسی تفسیریں ہیں ان سے معنی سمجھتا تو بھی وقت پر یاد نہ رہتے، یہ اُن کا تفضلات ہے کہ برائے خود ایک ایسی کتاب ترتیب دی کہ جس صورت میں جس آیت کا ترجمہ چاہے۔ پڑھ لے اور پہلے اس کی صلاح و مشورت بہت سی ہوئی کہ ہر ایک صفحے پر کلام اللہ لکھا جائے اور اس کے مقابل دوسرے صفحے پر ترجمہ مثبت ہو۔ لیکن صحت کے لئے یہ امر موقوف رکھا کہ ہرگاہ کتابت میں باوجود ہزاروں مقابلوں کے غلطی اعراب کی رہتی ہے۔ اس کا تو منظور چھاپا ہے کیونکر غلطی نہ رہے گی اور جب کہ غلطی رہی یک زیر و زبر و پیش میں یا ساکن کرنے میں معنے لفظ کے اور ہو جائیں گے۔ ترجمے کی مطابقت خلل عظیم واقع ہوگا۔ ہاں جس کو یہ غرض ہوگی کہ قرآن کے جملے اور آیت و مطلق ترجمے سے مقابلہ کرے قرآن شریف بکثرت ہیں مقابلہ کرے گا۔ چنداں دقت نہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سرکار دولت مدار کو قائم رکھے کہ ان کی بدولت دین و دنیا کے امور بخوبی سرانجام پاتے ہیں، قیامت تلک نام نیک ان کا صفحۂ روزگار پر رہے گا۔

کاظم علی جوان نے یہ خاتمہ موافق ارشاد صاحب ممدوح کے لکھا ہے اور جو کچھ آغاز سے انجام تلک حقیقت گزری ہے وہ سب اس میں مندرج کی ہے۔

یہ التماس ہے خدمت میں سب کے شام و سحر

امیدوار دعا ہے یہ بندۂ مضطر"

ذیل میں بطور نمونے کے دو ایک صورتوں کا ترجمہ لکھا جاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کا ترجمہ

خدا کے نام سے جو بڑا بخشنے والا نعمت دینے ہارا ہے۔ ہر ایک حمد خدا کے لئے ہے کہ وہ مالک سب کا بخشنے ہارا، روزی دینے والا، خاوند روز قیامت کا ہے۔ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ دکھا ہم کو سیدھی راہ، ان کی راہ کہ جن کو تو نے نعمت دی نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی۔

الم کی چند ابتدائی آیتوں کا ترجمہ

یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں۔ راہ دکھانے والی اُن پرہیزگاروں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز کیا کرتے ہیں اور جو کچھ کہ ہم نے روزی ان کو دی اس میں سے خیرات کرتے ہیں اور جو کہ ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو تجھے بھیجی گئی اور اس پر جو تجھ سے آگے نازل کی گئی اور قیامت پر وے ہی یقین لاتے ہیں وے اپنے پروردگار کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں اور وے ہی مطلب کو پہنچیں گے۔ بتحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے انھیں برابر ہے خواہ تو ان کو ڈراوے یا نہ ڈراوے ایمان نہ لاویں گے۔ خدا نے اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر کی ہے اور پردے اُن کی آنکھوں پر ہیں۔ انھیں کے لئے بڑا عذاب ہے۔"

عہد شاہ عالم ہی کی یادگار "تفسیر چراغ ابدی" بھی ہے۔ اس کے مصنف عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آباد دکن کے باشندے ہیں۔ سنہ تالیف ۱۲۲۱ھ ہے یہ صرف آخری پارے کی تفسیر ہے۔ مؤلف نے دیباچے میں تفسیر کی ضرورت، زبان کی نوعیت، سنہ تالیف کی کیفیت وغیرہ کا ذکر وضاحت سے کر دیا ہے۔ یہاں اس کی نقل کر دی جاتی ہے تاکہ ان تمام امور پر آگاہی ہو جائے۔

" امابعد، عرض کرتا ہے دوست داروں سے، آشنایوں سے غمگساروں سے، زاویہ نشین کوچۂ گمنامی و بے استعدادی، طالب منصب وارستگی و آزادی فقیر عزیز اللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی اورنگ آبادی المتخلص بہمرنگ عفا اللہ عنہ وعن والدیہ واحسن الیہما والیہ کہ جب دیکھا میں اکثر تفسیریں کلام اللہ کی زبان عربی اور فارسی میں واقع ہیں اور کم علمی بعض اہل ہند کی دریافت سے معنے ان کے مانع۔ اگرچہ بعض عزیزوں نے زبان دکنی ہندی آمیز میں تفسیر جز آخر کی لکھی ہے لیکن بہ سبب الفاظ دکھنی لطف زبان ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے مطالعہ اس کے رغبت کم لاتا۔ اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کی آیا کہ تفسیر جز آخر کی زبان ہندی میں کہ بالفعل اورنگ آباد کے

لوگوں کا محاورہ ہے لکھے اور بعض فوائد کہ دوسری تفسیروں میں نہیں ہیں کتب معتبرہ سے جمع کر کے اس میں داخل کرے کہ عوام اس سے باوجود قلت بضاعت کے فائدہ تمام اُٹھاویں اور اس حقیر کی دعائے مغفرت سے یاد دلادیں۔

تا اسے ہو وسیلۂ عقبیٰ — اور سب کو مفید روزِ جزا

بعد تقدیم استخارے کے اور استعانت حضرت باری کے ہر سورۃ کی فضیلت اور نفع اور تفسیر اور خاصیت اور خاتم اور تعبیر کو بعضی سورہ کی فضیلت اور خاصیت کہ مخصوص نماز کے اندر پڑھنے میں یا مخصوص آیت یا آیتوں میں تھی، تمام قیدِ قلم لاکر اول تعوذ اور تسمیہ اور سورۂ فاتحہ سے کہ سبب یمن اور برکت کا ہے، مناسب بروج کو شروع کیا اور واسطے نشانی کے اول حرف ایک سرخی سے علاحدہ لکھا اور اشارہ ان حرفوں کا اس قطعے میں کہا۔

ف فضیلت کی نشانی عین ہے منفعت — اور صلوٰۃ وختم کی ہوگی علامت صاد میم

خاصیت تعبیر کا ہوگا اشارا خ وت — ہے امید ہمرنگ کو حق سے سدا لطفِ عمیم

اور نام اس تفسیر کا "چراغِ ابدی" (سنہ ۱۲۲۱) کہ سال تاریخ کا اس کے اسی کلمے سے نکلتا ہے، رکھا۔ توقع علمائے روزگار اور بلغائے ہر دیار اور تمنا فضلائے اعصار اور فصحائے امصار سے وہ ہے کہ اگر اس میں سہو یا خطا کہ مقتضیٰ بشریت کا ہے، پاویں تو قلم الطاف رقم سے اصلاح دیویں اور راہِ اعتراض اور اغماض کی نہ لیویں۔ قطعہ

کاملوں سے توقع ہے ہمرنگ — کہ توجہ سے ان کے ہوے فلاح

پاویں گر بیچ اُس کے سہو و خطا — لطف اپنے ستی کریں اصلاح

ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے جس سے تفسیر کا سنہ تالیف معلوم ہوتا ہے۔

قطعہ

محنت اور کوشش بسیار ستی اے ہمرنگ — جب یہ تفسیر تمام ہوئی بعون صمدی

نام میں چاہا رکھوں ایسا کہ نکلے تاریخ — فکر کر دل نے اٹھا بولا "چراغِ ابدی"

اس میں ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ مولف نے اورنگ آباد کی زبان کی علٰحدہ حیثیت قرار دی ہے جس کا دکھنی زبان سے تعلق نہیں ہے اور ہے بھی یہی کہ ابتدا سے اور خصوصًا شاہجہاں اور اورنگ زیب کی صوبہ داری میں اس کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند کی زبان سے رہا اور وہاں کے اہل زبان اور شعرانے جو زبان لکھی ہے وہ حیدرآباد، بیجاپور اور علاقۂ مدراس کی زبان سے بالکل الگ ہے۔ وہ زیادہ تر شمالی ہند کی زبان کی تقلید کرتے تھے۔

نمونۂ تفسیر

(عم یتساءلون) کس چیز سے پوچھتے ہیں کافراں (عن النباء العظیم) پوچھتے خبر بڑی سے یعنی قرآن اور نبوت اور قیامت سے (الذی ہم) ایسی وو خبر کہ یہ کافراں (فیہ) بیچ اس خبر کے (مختلفون) اختلاف کرنے والے ہیں۔ یعنی قرآن کو جادو اور شعر اور کہانت سے نسبت دیتے ہیں۔ اور لو بیدا اور کہانی بولتے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلوٰت اللہ الاکبر کو کہتے ہیں کہ وہ پیغمبر ہے یا نہیں، یا ساحر ہے یا شاعر یا مجنوں، اور دن قیامت کا بعضے کہتے تھے کہ ہو یگا اور بتاں ہماری شفاعت کریں گے اور بعضے کہتے تھے کہ دن قیامت کا ہرگز نہ ہو یگا اور سوائے زندگی دنیا کی پھر اور زندگی نہیں ہے۔ اور بعضے شک میں تھے کہ ہوگی یا نہیں، حق سبحانہ تعالیٰ فرمایا (کلا سیعلمون) حقا کہ شتابی ہے کہ جانیں گے کافراں دن قیامت کا نزدیک جان کندن کے اور مرنے کے، وہ دن حق ہے واسطے ظاہر ہونے نشانیاں اوس دن کی بیچ اوس وقت کے (ثم کلا سیعلمون) پیچھے تحقیق شتابی ہے کہ جانیں گے دن قیامت کے جھوٹی باتیں اور اعتقاد پلید اپنے (الم نجعل الارض) آیا نہیں ہم نے کیا زمین کے تئیں (مہاداً) فرش ایک بچھا ہوا کہ مکان رہنے کا تمہارے ہووے۔

بوجا چاہئے کہ اندر کرۂ آب کے زمین مانند گیند کے پڑی ہے اور ایسے کہ آدھی سے زیادہ پانی میں غرق ہے اور آدھی سے کم باہر ہے اور جو کہ باہر ہے وہ دو قسم پر ہے۔ ایک قسم تو محض ویران ہے کہ نشانی معموری کی بیچ اوس کے اصلا نہیں دوسری

قسم معمور ہے کہ اُسے ربع مسکون کہتے ہیں اوراس میں دریائیں، پہاڑیں، اور میدانیں اور جنگلیں اور شہریں واقع ہیں اور مساحت اُس کی ایک سو بیس برس کی راہ ہے۔ اوس میں سے نوذ ، برس کی راہ تو یاجوج اور ماجوج جو فرزندوں سے یافث بن نوح علیہ السلام کے ہیں اور بارا برس کی راہ حبشہ بستے ہیں اور آٹھ برس کی روم اور تین برس کی راہ عرب رہتے ہیں اور سات برس کی راہ تمام لوگ دوسرے ساکن ہیں۔ امام احمد قسطلانی رحمتہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح میں اس طرح کی تفصیل بعضی کتابوں سے نقل فرمائی ہے اور یہی شرح مذکور میں لائے ہیں کہ زمین میں مخلوقات بہوت ہے اتنی کہ بہ نسبت فرشتوں کے اور شیاطین کے اور جن اور بنی آدم کے ہزار میں کا ایک حصّہ ہے۔

فائدہ۔ تفسیر بقائی میں لاتے ہیں کہ زمین پانی پر ہے اور پانی مچھی پر اور مچھی تختے پر اور تختہ فرشتے کے سر پر اور فرشتہ بیل کے سر پہ اور بیل مچھر پہ اور مچھر کف پہ دریا کے اور دریا ٹیری پر اور ٹیری دوزخ کے سر پہ اور دوزخ اندھارے پر اور اندھارے کے نیچے سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی جانتا نہیں ہے کہ کیا ہے۔ واللہ اعلم واحکم (الجبال) اور نہیں کیا ہم نے پہاڑوں کے تئیں (اوتادا) میخیں زمین کی تا بسبب اون کے زمین مضبوط رہے (وخلقنکم) اور پیدا کیا ہم نے تمکو (ازواجاً) ہر طرح کے جوڑے نر اور مادہ تاکہ نسل تمہاری باقی رہے یا پیدا کیا ہم نے تمہیں طرح طرح کی کالی اور گوری دراز اور کوتی، خوب اور ناخوب (وجلعنا) اور کیا ہم نے (نومکم) نیند کو تمہاری (سباتا) راحت بدن کی تمہاری کہ نیند حس و حرکت کو موقوف کرے تا قوت حیوانی آرام پکڑے اور ماندگی تمہاری زائل ہوے۔"

اِسی عہد کی ایک اور تفسیر ہے۔ یہ بھی پارۂ عم کی ہے، لیکن منظوم ہے اس کے مصنف مولانا شاہ غلام مرتضیٰ تخلص جنوں ہیں۔ مصنف کے نام کی نسبت سے کتاب کا نام بھی "تفسیر مرتضوی" ہے۔ میرے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے اور ایک

مطبوعہ نسخہ جو سنہ ۱۲۵۹ ہجری میں نسخ ٹائپ میں چھپا۔ مطبع کا نام مطبع طبیؔ ہے جو مولوی عبدالماجد بن حکیم مولوی عبدالمجید کا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مقام کا نام نہیں لکھا اور اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مطبع کہاں تھا۔ تصحیح اس کی حافظ محمد صدیق صاحب اور مولوی محمد وجیہ صاحب مدرس مدرسہ کمپنی بہادر نے کی اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کلکتے میں ہوگا۔ قلمی نسخے میں منظوم دیباچہ بھی ہے جو مطبوعہ نسخے میں نہیں۔ اس دیباچے سے مصنف کا اتا پتا اور سنہ تصنیف معلوم ہوتا ہے اپنا نام کئی جگہ لکھا ہے۔

سن غلام مرتضیٰ میرا ہے نام
ٹک سمجھ لیجو کہ ہوں کس کا غلام

مصحفی کے تذکرہ ریاض الفصحا میں ان کا ذکر ہے لیکن سوائے نام اور تخلص کے اور کچھ نہیں لکھا۔ اپنے مرشد کی تعریف میں بھی کچھ شعر لکھے ہیں۔

حضرت سید محمد تو ہے پیر
دونوں عالم میں مرا ہے دستگیر

اپنے والد کا بھی ذکر کیا ہے اور چند شعر ان کی خدمت میں عرض کئے ہیں۔

بے گماں اے شاہ تیمور ولی علم ہے عالم میں تیرا منجلی
چاہئے ہو باپ کا بیٹا شبیہ کیونکہ ہے الولد سر للابیہ

استاد کی بھی مدح کی ہے جن کا نام مولوی محمد برکت اللہ تھا۔

ہے مرا استاد فخر عالماں
مولوی برکت محیط بیکراں

اس کے بعد بادشاہِ وقت شاہ عالم بادشاہ کے لئے بارگاہ الٰہی میں دعا کی ہے۔

وارثِ تیمور و زیبِ تاج و تخت شاہ عالم بادشاہِ نیک بخت
کشورِ ہندوستاں کا شاہ ہے حامیٔ دینِ رسول اللہ ہے

بادشاہ کے بعد وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح ہے۔

آصف الدولہ وزیرِ مملکت حامیٔ دیں ہے وشیر سلطنت
آصف وقت وسلیمان زماں ہے سکندر بخت ودارائے جہاں

سبب تصنیف کتاب میں سنہ تالیف بھی بتا دیا ہے۔

سن تھا ہجری ان دنوں میں جان لے
یک ہزار و ایک سو چورا نوے

تفسیر کا انداز ذیل کے نمونے سے ہوگا۔

عم یتساءلون

اصل میں تھا عم عما اے لبیسر نون کیتئیں کر میم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنے بجاں پوچھے ہیں کس چیز سے یہ کافراں

عن النباء العظیم الذی ھم فیہ مختلفون

اس خبر سے کہ بڑی ہے بے خلاف کرتے ہیں سب جس میں باہم اختلاف
یا کتاب اللہ ہے نبا عظیم قولِ شاعر جس کو کہتے ہیں لئیم
یا کہیں ہیں سحر یا ہے مفترا نزد بعضے ہے کلام کبریا
یا محمد ہے کہ جمع مومنین اس کیتئیں کہتے ہیں ختم المرسلیں
یا کہ ہے اس نبا سے محشر مراد اِس سے نہ آگاہ جز رب العباد

ہولاء شفعاؤنا عند اللہ

حشر کو کہتے ہیں حق ہے مشرکاں ہم کو بخشا دیں گے پیشِ حق بتاں

ان ہی الا حیاتنا الدنیا

منکران حشر کہتے ہیں ہنوز نہ مگر یہ زندگی ہے چند روز

بل ہم فی شک منہا

اور کہتے ہیں شک میں ان نبا عظیم کیونکے ہوں گے زندہ یہ عظم رمیم
تاکہ رد ہو جائے قول ناصواب یہ دیا کفار کو حق نے جواب

الم نجعل الارض مہاداً

آیا یہ ہم نے کیا ہے خاک سے — فرش گستردہ تمہارے واسطے

اے بچھائی ہم نے پانی پر زمیں — مردہ اور زندوں کے رہنے کیتئیں

والجبال اوتاداً

اور کیا کوہوں کو میخیں استوار — تا نہ کانپے اور زمیں پکڑے قرار

وخلقنا کم ازواجاہ

اور تمہیں پیدا کیا ہے ہم نے جفت — اے نر و مادہ کو بے گفت و شنفت

یعنے زن اور مرد کو پیدا کیا — ایک کا دل ایک پر شیدا کیا

تاکہ ان دونوں سے پیدا ہو بسر — جیسے آب و خاک سے کشت و ثمر

یا مراد ازواج سے ہے قسم قسم — مختلف در صورت والوان و جسم

زبان صاف سیدھی ہے۔ لیکن ایسی چیزوں کا ترجمہ اور وہ بھی نظم میں سراسر بے لطف ہو جاتا ہے۔

ایک صاحب سید بابا القادری متوطن حیدر آباد دکن نے بھی ایک تفسیر لکھی ہے جس کا نام " فوائد البدیہیہ " ہے۔ اصل میں یہ قرآن شریف کا ترجمہ ہے تفسیر برائے نام ہے، کہیں ایک آدھ جملہ یا لفظ بطور تفسیر کے آجاتا ہے۔ خود مولف نے بھی اسے ترجمے ہی سے موسوم کیا ہے جیسا کہ آیندہ سطور سے معلوم ہوگا۔ یہ بھی شاہ عبدالقادر کی طرح اپنی زبان کو ہندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ سنہ تصنیف ۱۲۴۰ ہجری ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ سرکار عالی میں موجود ہے۔ آخری حصہ نہیں ہے۔ اس کے خطبے (دیباچے میں اس کے مولف، سبب تالیف اور سنہ تالیف کی صراحت موجود ہے۔ خطبے کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اما بعد فیقول الفقیر الحقیر بلا بضاعت سید بابا القادری الحیدر آبادی بن سیدی و مرشدی و علامۃ العصر الجامع بین العلوم الظاہر والباطن و صاحب التصانیف فی المعقول والمنقول والتصوف سید شاہ محمد یوسف القادری بن سید شاہ محمد

اسکنہم اللہ المحبوبہ جنانہ انی قد اخذۃ الخرقہ من اخی العینی حضرت شاہ عبداللہ القادری المتعارف بہ قطبی صاحب نفعنا اللہ بہ وعمرہ الٰہی کبر الاکبر روزے چند بتدریس و وعظ اشتغال داشت کہ بعضے از دوستاں صمیمی سید لعل شاہ و سید قلندر بخش متوطن سرہند از اولاد حضرت بندگی اسمٰعیل قدس سرہٗ خصوصًا مرزا محمد بیگ بن مرزا حاجی بیگ خاں ومیاں محمد علی باعث کہ شدند (؟) علمائے پیشیں علی قد اہیم تفاسیر عربی وفارسی تالیف فرمودہ اند۔ الا کہ ہم ما یاں مغلوب القصور از ادراک آں قاصر باید کہ تفسیر بعنوان ترجمۂ کلام مجید بزبان ہندی در تحریر آید کہ فائدہ وغیرہ از قصص مرتب الاحوال گردد۔ لہٰذا نظر وفور اشتیاق ایشاں نمودہ خواست کہ آنچہ در فہم ناقص آید بزبان ہندی ترجمۂ کلام ربانی و بعضے کلام شان نزول مفید بہ قلم آرد۔ لہذا مستدعی از ناظران عالی فطرت آنست ہر جا کہ خطا وسہو واقع شود۔ قلم اصلاح براں جاری دارند واز طعن معاف فرمایند۔ پس شروع کردم ایں کتاب فی شہر ذلیقعد سنہ ۱۲۴۰ھ[۱] اربعین وماتین بعد الالف الہجریہ المبارکہ۔ در عہد نواب مستطاب سکندر نژاد فریدوں عصر نواب سکندر جاہ بہادر ادام اللہ ملکہ ومتع المسلمین بطول بقائیہ ...... ونام نہادم تفسیر را، فوائد البدیہیہ"۔

ترجمے کا نمونہ یہ ہے۔

(ذالک الکتاب) یہ کتاب یعنی قرآن شریف (لاریب فیہ) نہیں شک ہے بیچ اس کتاب کے، اس کتاب کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ مالک ابن حنیف یہودی تھا۔ مسلمانوں کے دل میں شک ڈالتا تھا کہ یہ کلام اللہ وہ کتاب نہیں مگر جس کے نازل کرنے کا وعدہ خدائے تعالیٰ نے توریت میں کیا تھا۔ (ہدی للمتقین الذین) ہدایت کرنے ہارا ہے یہ کلام اللہ واسطے پرہیزگاروں کے ایسے پرہیزگار (یومنون بالغیب) ایمان لاتے ہیں وہ لوگ ساتھ غیب کے یعنی جو چیز کہ نہیں دیکھی جیسا کہ جنت اور دوزخ اور سوائے اس کے۔ (یقیمون الصلواۃ) اور قائم کرتے ہیں نماز

---

[۱] کاتب نے اصل کتاب میں غلطی سے سنہ ۱۲۰۴ھ لکھ دیا ہے۔

کے تئیں۔ (ومما رزقنہم ینفقون) اور اس چیز سے کہ رزق دیے ہم نے ان لوگوں کے تئیں خرچ کرتے ہیں۔ وہ لوگ خدا کی راہ میں۔

(والذین یومنون بما انزل الیک) اور ایمان لاتے ہیں اس چیز سے کہ نازل کیا گیا اول تمہارے یعنے توریت اور انجیل اور زبور"

پارۂ عم کی ایک تفسیر سید شجاع الدین کی لکھی ہوئی ہے۔ خاتمے پر یہ عبارت ثبت ہے۔

"بعون عنایت الٰہی این تفسیر تصریح کہ سید شجاع الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بزبان میمنت ترجمان بیان فرمودند بتاریخ یازدہم روز جمعہ شہر محرم الحرام ۱۲۴۸ ہجری مقدسہ اختتام یافت"

اگرچہ یہ سنہ کتابت ہے لیکن تالیف کا سنہ بھی یہی یا اس کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ و تفسیر کا نمونہ یہ ہے۔

(عم یتساءلون) کس چیز کے آپس میں ایک کو ایک پوچھتے ہیں کافر۔ پھر آپ ہی فرمایا (عن النباء العظیم) خبر بڑی سے کہ وہ قرآن ہے (الذی ہم فیہ) ایسا قرآن کہ وہ کفار اوس میں (مختلفون) اختلاف کرنے والے ہیں کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ (کلا سیعلمون) تحقیق جلدی جانیں گے جب قیامت آئے گی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے اور قرآن خدا کا کلام تھا (ثم کلا سیعلمون) پھر تحقیق جلدی جانیں گے کہ بُرا کیا ہم نے جو ایمان نہ لائے (الم نجعل الارض مہاداً) آیا نہیں کیے ہم زمین کو بچھونا کہ اوس پر سب ٹھیریں (والجبال اوتادا) اور پہاڑوں کو میخیں۔ جب زمین کو پیدا کیا تو وہ پانی پر ہلتی تھی پھر پہاڑوں کی میخیں اس پر رکھا تب زمین ٹھیری۔ (وخلقناکم ازواجا) اور پیدا کئے ہم تمہیں جوڑے جوڑے کہ تم سے اولاد ہوے بھانت بھانت کی جیسے کالی گوری اونچی نیچی اچھی بُری۔ (وجعلنا نومکم سباتا) اور کیے ہم نیند کو تمہاری کہ بدن کو آرام پہنچے اور ماندگی دور ہوے (وجعلنا الیل لباسا) اور ہم رات کو لباس کہ سب کو اندھارے سے ڈھانپے (وجعلنا النہار

معاشا) اور کئے ہم دن کو وقت زندگی کا کہ اوس میں روزی پیدا کرو اور پھرو چلو پکاؤ کھاؤ "۔

سورۂ فاتحہ کی ایک تفسیر اکرام الدین نے سنہ ۱۲۴۲ھ میں لکھی ہے ۔ یہ نثر میں ہے ۔ ختم مضمون پر سورہ فاتحہ کی فضیلت کا بیان ہے ۔ دیباچے کی ابتدائی سطریں نقل کی جاتی ہیں جن میں مصنف نے تفسیر کے متعلق چند ضروری باتیں لکھی ہیں ۔

" بندۂ ضعیف حقیر کمترین اکرام الدین کو اکثر مسلمان بھائی خصوصاً میر حسین علی نے رغبت دلائی اس بات پر کہ اگر سورۂ فاتحہ کا زبان ہندی میں بیان ہو جاوے تو سب مسلمانوں کو اپنے ایمان کا دھیان ہو جاوے کیونکہ اس سورہ کا نام ام الکتاب ہے آخر رسالے میں اس ام الکتاب کی فضیلت کا بیان ہے اور اس مختصر کا نام تحفۂ اسلام ہے ۔ الحمد للہ کہ یہ رسالہ سن بارہ سو بیالیس ہجری عشرہ محرم الحرام میں تمام ہوا ۔"

پارۂ عم کی ایک اور تفسیر بھی مجھے ملی ہے جس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۵۴ ہے یہ بھی ترجمہ ہے ، کہیں کہیں بطور تشریح کے کچھ کچھ جملے اضافہ کر دیئے گئے ہیں ۔ بطور نمونے کے شروع کی چند آیتوں کا ترجمہ لکھا جاتا ہے ۔

" کس چیز سے سوال کرتے ہیں وہ کافر آپس میں پھر آپ فرمائے ۔ سوال کرتے ہیں وہ خبر سے کہ بڑی ہے یعنی قرآن شریف اور نبوت اور قیامت سے ۔ ایسی خبر عظیم کہ وہ کافر بیچ اس کے اختلاف کرنے والے ہیں ۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ ۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ۔ حق ہے کہ قریب جانیں گے وہ جب قیامت آتے گی کہ پیغمبر سچے تھے اور قرآن حق تعالیٰ کا کلام تھا ۔ پھر حق ہے کہ قریب جانیں گے وہ دن قیامت میں کہ بُرا کیا ہم نے جو ایمان نہ لائے ۔ کیا نہیں کئے ہم نے زمین کے تئیں بچھونا تا کہ رہو تم اور پہاڑوں کے تئیں میخیں اور پیدا کئے ہم تمہارے تئیں جوڑے کہ تم سے اولاد ہوے اور کئے ہم نے نیند کے تئیں تمہاری آرام بدن کا ماندگی

دن کی دور ہو۔"

اس کی زبان جیسا کہ اوپر کے نمونے سے معلوم ہوگا دکنی ہے۔

ایک صاحب نے بعض سورتوں اور آیتوں کی تفسیر لکھی ہے۔ تفسیر برائے نام ہے زیادہ ترجمہ ہے، اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے۔ اس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۵۴ھ ہے۔

ایک اور تفسیر سورۂ یوسف سے سورۂ حج تک دستیاب ہوئی ہے۔ شروع کے دو چار ورق غائب ہیں۔ آخر میں نہ سنہ تالیف وکتابت ہے اور نہ مولف کا نام۔ زبان کسی قدر پرانی ہے مگر سلیس ہے۔ ایسی سلیس اور صاف کہ اگر دو چار ایسے لفظ جیسے لانڈگا (یعنی بھیڑیا)، اپرال (بمعنے اوپر) کیلی (بمعنی کنجی) کہیں کہیں نہ آجائیں تو زمانے کے لحاظ سے اس کی شناخت مشکل ہو جائے کہ مصنف شمالی ہند کا ہے یا جنوبی ہند کا۔ ترجمے میں معروف عربی فارسی الفاظ بلاتکلف استعمال ہوتے ہیں۔ دو تین آیتوں کے ترجمے اور تفسیر کی نقل کی جاتی ہے۔

(قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیہم) کہا یوسف نے کہ میرے تئیں کر حکم کرنے والا زمین کے خزانوں کا، یعنی کاربار ممالک مصر کا مجھے سونپ کہ تحقیق میں محافظت کرنے والا ہوں تیرے مالکوں اور خبردار ہوں امور ممالک میں (وکذلک مکنا لیوسف فی الارض) جیسا کہ بادشاہ کوں مہربان کیا میں نے یوسف پر ویسا ہی مرتبہ دیا یوسف کوں زمین مصر میں۔ یعنے مقبول خلائق کیا بادشاہ کیاں۔ لائے ہیں کہ یوسف علیہ السلام ستر اور دو زبان جانتے تھے بیچ تفاسیر معتبر مذکور ہے کہ بادشاہ نے تخت زر سرخ مرصع سیں اور بھانت بھانت کے جواہر لگے ہوئے واسطے یوسف علیہ السلام کے مقرر کیا، تاج مکلل اوپر سر اوس کے رکھ کر کیلیاں خزانے کیاں سونپ کر اختیار ملک کا بیچ ہاتھ اس کے دیا اور عزیز کے تئیں تغیر کیا اور جو کام اس عزیز کے تھے عہدہ یوسف کے کیا۔ تھوڑے زمانے میں عزیز مر گیا اور بادشاہ التماس تمام سیں زلیخا کوں بیچ عقد یوسف کے دیا اور حق سبحانہ تعالیٰ نے یوسف کے تئیں دو بیٹے دیا۔

یتبوء منہا) کہ تا جگا پکڑے زمین مینے، یعنی زمین ملک مصر کے بیچ چالیس فرسخ کی عرض رکھتی تھی (حیث یشاء) جہاں چاہے زمین مصر میں سے (نصیب برحمتنا من نشاء) پہنچاتے ہیں ہم رحمت سیں جس کو چاہتے ہیں۔ (ولا نضیع اجر المحسنین) اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر نیکو کاروں کا۔"

بظاہر یہ تفسیر فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے جیسا کہ جملوں کی ترکیب سے ظاہر ہے لیکن ابتدا میں عام طور پر اُردو زبان کا اور خاص کر ترجمے میں عبارت کا یہی ڈھنگ تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ "لائے ہیں" لکھا ہے جو "آوردہ اند" کا لفظی ترجمہ ہے۔

ایک تفسیر سورۂ یوسف نظم میں حکیم محمد اشرف متوطن قصبۂ کاندھلہ نے لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۶۸ھ ہے۔ طریقہ یہ رکھا کہ عنوان میں قرآن کی آیت ہے اور نیچے اس کا اُردو ترجمہ نثر میں اُس کے بعد نظم میں اس کی تفسیر بعض مقامات کی تفصیل بہت طویل ہے۔ نظم رواں اور صاف ہے مگر فصیح نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(وترکنا یوسف عند متاعنا فاکلۂ الذئب وما انت بمومن لنا ولوکنا صادقین) اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب پاس پھر اُس کو کھا گیا بھیڑیا اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اگرچہ ہم سچے ہوں۔

بٹھا ہم نے یوسف کو کپڑوں کے پاس
گئے دوڑتے سب کے سب بے ہراس

کہ اتنے میں بھیڑا اُسے کھا گیا
یقیں ہوگا تجھ کو کب اس بات کا

اگرچہ ہم آپس میں ہیں راست گو
ولے اس کو کب راست جانے ہے تو

یہ آیت کے معنے ہوئے ہیں بیاں
اب آگے سنو اس کی ہے داستاں

سنا جبکہ یعقوب نے یہ کلام
ہوا کام گویا کہ اس کا تمام

گرا کھا کے غش اور گیا دل دھڑک
غشی میں رہا شام سے صبح تک

لگی رونے اولاد اس کی تمام
کہا سب نے بیجا ہوا ہم سے کام

کیا قتل بھائی کو اور باپ کو | گنہگار ہم نے کیا آپ کو
قیامت کو کیا دیں گے اس کا جواب | خدا جب کہ لیوے گا ہم سے حساب
یہ کہہ کر کے روتے تھے چھوٹے بڑے | اور آگے تھے یعقوب ان کے پڑے
جو دیتے جنبش نہ ہلتے تھے وہ | کسی طرح سے نہ سنبھلتے تھے وہ
کہا بعض نے ایک بارہ سے گم | ہوا اس کا بیٹا یہ دیکھو ہو تم
عجب اس کی حالت ہے مرتا ہے یہ | نہ بولے ہے نے سانس بھرتا ہے یہ
وہ جس کی فقط ایک اولاد ہو | وہ مر جائے تو پھر کیوں نہ برباد ہو

اِس کے بعد ایک حکایت اِسی مضمون کی بیان کی ہے۔

"تفسیر وہابی" پورے قرآن کی تفسیر ہے۔ مصنف نے تفسیر کے خطبے میں سببِ تصنیف اور وجہ تسمیہ وغیرہ کا اظہار کر دیا ہے۔ خطبے کے اِس حصّے کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے۔

"بعد حمد اور نعت کے کہتا ہوں کہ اس تفسیر کا نام تفسیر وہابی رکھا ہوں اور اِس تفسیر کے بنانے ہارے کا نام عبد الصمد بیٹا نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ عبد الوہاب خان بہادر نصرت جنگ کا فرزند[۱] ضعیف کے خاطر میں آیا کہ بہوت تفسیراں عربی اور فارسی ہیں لیکن دکنی تفسیر شاید کہ کم ہیں بلکہ نہیں ہیں۔ اس واسطے سب مرداں اور عورتوں کو قرآن مجید کے معنی معلوم ہو کر عالم کو فائدہ ہونے کے واسطے دکنی زبان سے بنایا ہوں۔ اگر کوئی عالم اور فاضل اس تفسیر کو پڑے تو کرم کی رہ سیں اس کے مطلب کی کمی اور زیادتی کو دریافت کر کر درست کریں اور مغفرت چاہیں اور یہی التماس سب پڑھنے ہاروں کی خدمت میں ہے، چاہئے کہ اس تفسیر کے پڑھنے ہارے میری التماس قبول کر کر مہربانی کریں۔"

آخر میں سنہ اور تاریخ ان الفاظ میں لکھی ہے۔

---

[۱] یہاں "فرزند" کا لفظ کاتب نے غلطی سے بڑھا دیا ہے۔

"فی شہر جمادی الثانی یوم السبت من عشرین ہذا شہر سنہ ثمانین و سبع بعد الالف من ہجرۃ النبوی صلی اللہ علیہ وسلم"۔

سنہ ۱۰۸۷ھ جو اس میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

تزک والاجاہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ بہادر نصرت جنگ، امیر الہند والاجاہ کے برادر حقیقی تھے۔ امیر الہند والاجاہ کی ولادت سنہ ۱۲۳۵ھ میں واقع ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ سنہ صریحاً غلط ہے۔ غالباً سنہ ۱۲۸۷ ہوگا۔ زبان بھی اس کی پرانی نہیں معلوم ہوتی بلکہ صاف ہے اور تقریباً ویسی ہی زبان ہے جیسی آج کل جنوبی ہند میں مروج ہے۔ نمونے کیلئے "سورۂ قارعہ" کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

(القارعۃ ما القارعۃ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قارعہ قیامت کے روز کو کہتے ہیں اور اس روز لوگاں ہول سے کہیں گے کہ قارعہ کیا ہے (وما ادراک ما القارعۃ) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بندگان تم قارعہ کو کیا جانتے ہیں (یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعہن المنفوش) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک روز حشر کا ہے کہ اس روز تمام آدمیاں پتنگے کے مانند بکھرے جائیں گے یعنی پریشان ہوئیں گے اور پہاڑاں روئی کے مانند پنجے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے (فاما من ثقلت موازینہ فہو فی عیشۃ الراضیہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جسکی نیکی کا وزن زیادہ ہوں گا وہ شخص نیک زندگی سے بہشت میں جائے گا۔ (واما من خفت موازینہ فامہ ہاویہ) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس کے نیک عمل کا بوجھا ہلکا ہوگا اسے اللہ تعالیٰ ہاویہ میں ڈالے گا اور ہاویہ بھی ایک دوزخ کا نام ہے (وما ادراک ماہیہ) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہاویہ کیا چیز ہے کر کے تم جانتے ہیں (نار حامیہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گرم آگ ہے یا جلانے ہاری آگ ہے۔"

ایک قلمی تفسیر سورۂ کہف سے سورۂ عنکبوت تک ہے۔ یہ بھی دراصل ترجمہ ہے البتہ کہیں کہیں تصریح کے لئے چند جملے اضافہ کر دیئے گئے ہیں۔ زبان دکھنی

ہے لیکن قدیم نہیں - نمونے کے طور پر سورۂ قصص سے چند آیتوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے -

(آیات الکتاب المبین) آیتاں ہیں کتاب ظاہر کی کہ ظاہر کرنے ہارا ہے راہِ راست کے تئیں (نتلوا) تلاوت کرتے ہیں ہم (علیک) اوپر تمہارے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (من نباء موسیٰ و فرعون) خبر سے موسیٰ اور فرعون کی (بالحق) سات راستی کے (لقوم مومنون) واسطے قوم جو ایمان لاتے ہیں (ان فرعون) تحقیق فرعون (علا فی الارض) تکبر کیا بیچ زمین مصر کے (وجعل) اور گردانا فرعون (اہلھا) لوگوں کے تئیں اوس مصر کے (شیعاً) گروہ گروہ اور ہر گروہ کے تئیں ایک کام مقرر کیا (یستضعف) اور ضعیف کرتا تھا یعنی مقہور کیا (طایفۃ منہم) ایک گروہ کے تئیں اون بنی اسرائیل میں سے (یذبح ابناءھم) ذبح کرتا تھا فرعون فرزندوں کے تئیں ان بنی اسرائیل کے (ویستحی نساءھم) اور زندہ رکھتا تھا عورتوں کے تئیں اون کی واسطے خدمت قبطیوں کے (انہ کان) تحقیق وہ فرعون تھا (من المفسدین) فساد کرنے ہاروں سے۔

ایک تفسیر جو میاں شاہ مخدوم حسینی کی تالیف ہے مجھے دستیاب ہوئی لیکن آخر سے ناقص ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی تھی یا صرف چند پاروں کی - مولف کا حال بھی کہیں نہیں ملا - زبان سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ بھی تیرھویں صدی کی ہے - ترجمے کے ساتھ کہیں کہیں تصریح کے لئے کچھ کچھ عبارت اضافہ کر دی گئی ہے - ابتدا الم سے ہوتی ہے - اس کی ابتدائی چند آیتوں کا ترجمہ مع تفسیر نقل کیا جاتا ہے -

(ذالک) یہ وہ کتاب ہے کہ خداوند عالیشان دو کتابیں آگے کے ساتھ اتارنے اس کتاب کے وعدہ دیا تھا (الکتاب) یہ کتاب کامل ہے یعنی قرآن مجید (لاریب) کچھ شک و شبہ نہیں ہے (فیہ) بیچ اس کتاب کے یعنی ظاہر ہونے سے حجت کے اور واضح ہونے سے دلیلوں کے یہ کتاب سات اس مانند کے ہے کہ جو کوئی کہ بیچ اس کتاب کے اونا فکر اپنی متوجہ کرے از شک خود کھڑے رہ جاوے

اور جانے کہ شبہ کیتئیں بیچ اس کتاب کے طاقت اپنی کی نہیں ہے (ہدیٰ) دلالت کرنے والی اور راہ بتانے والی (للمتقین) خاص پرہیزگاروں کے تئیں، کیونکہ یہ پرہیزگاراں سات اوس کتاب کے فائدہ پائے ہوئے ہیں (الذین) وہ لوگ کہ سانچ پنے اعتقاد اپنے سے (یومنون) خواہش کرتے ہیں (بالغیب) سات نیں دیکھی ہوئی چیز کے۔ وہ کون ہے یعنی حق تعالیٰ اور وہ کون یعنے فرشتے اور وہ کون ہے یعنی قیامت کا دن سات علاقہ والے اُس قیامت کے یا چھپا ہوا وحی ہے۔ اور کہے ہیں مراد غیب سے قضا و قدر ہے کہ مسلمانوں نے سات اُن چیزوں غیب کے ایمان لائے ہیں (ویقیمون) اور قائم رکھتے ہیں اور ادا کرتے ہیں (الصلوٰۃ) نماز پانچ وقت کے تئیں سات شرطیں اور ادبیں اُس نماز کے یعنی واجبات اور مستحبات نماز کے ادا بخوبی کرتے ہیں (ومِمّا رزقناہم) اور اس چیز سے سات ان متقیوں کے بخشش کئے ہم (ینفقون) نفقہ کرتے کرتے ہیں اوپر اہل و عیال اور قرابتی اور ہمسایہ والے صاحب حق داروں کے۔

یہ تفسیر بھی بعد کے زمانے کی ہے اس میں قدیم الفاظ کہیں نہیں آتے لیکن زبان دکنی ہے۔ مثلاً چھپنا چھونے کی جگہ استعمال کیا ہے اور اسما کی جمع اُن سے بنائی گئی ہے مثلاً لوگاں، مایاں وغیرہ۔ عبارت اکثر ناقص بے ربط ہے۔

یہ ترجمے اور تفسیریں جن کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے۔ تیرھویں صدی کے آخر تک کی ہیں۔ موجودہ صدی کے ترجموں اور تفسیروں سے بحث نہیں کی گئی۔ ہر ایک کے ساتھ ترجمے یا تفسیر کا نمونہ بھی دے دیا گیا ہے تاکہ زبان کے اُتار چڑھاؤ کی کیفیت معلوم ہوتی رہے۔ پانچ کے سوا باقی سب قلمی ہیں۔

(رسالہ "اردو" جنوری ۳۷ء)

دکنی اُردو میں شاہنامے کی داستانیں

شاہنامۂ فردوسی اُن کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ چنانچہ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے۔ نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً ایسی نظم کا جو شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے بے مثال تسلیم کی گئی ہو، تاہم ترجمے کئے گئے ہیں بعض بہت اچھے، بعض معمولی۔ اُردو میں بھی شاہنامہ ہے۔ اسے ترجمہ تو نہیں کہہ سکتے، البتہ شاہنامے کی پوری داستان کو صاف زبان میں بیان کر دیا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی کچھ مدت بعد کی تالیف ہے۔ اب مجھے دکنی اُردو کی ایک ایسی ہی نظم ملی ہے جو اس سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں صرف چند داستانوں کا ترجمہ ہے۔ ابتدا زال کی پیدائش سے کی ہے اور سفید مو ہونے کے باعث اس کو جنگل میں پھینکنے اور سیمرغ کی پرورش وغیرہ کے حالات بیان کئے ہیں جو شاہنامے میں ہیں۔ زال اور رودابہ کا عشق، ان کا عقد اور رستم کا تولد ہونا۔ رستم کی جنگ افراسیاب، رستم کا کیکاؤس اور اس کے لشکر کو سفید اور مازندران کی قید سے چھڑانا۔ رزم رستم و سہراب، داستانِ سیاوش، انتقام قتل سیاوش

میں افراسیاب پر چڑھائی اور برزو سے رستم کی جنگ۔

شاہ نامہ اگرچہ بیانیہ نظم ہے تاہم اس میں جگہ جگہ ایسی شاعرانہ خوبیاں اور نزاکتیں پائی جاتی ہیں کہ ان کا ترجمہ اسی سلاست اور حسن کے ساتھ نہایت مشکل ہے۔ اُردو کے شاہ نامہ میں محض داستانوں کا سادہ بیان ہے۔ کوئی شاعرانہ خوبی نہیں۔ یہی حال اُس کی دکنی داستانوں کا ہے۔ دونوں میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جہاں زیادہ تفصیل ہے اُسے کم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب رستم سہراب کو زخمی کر دیتا ہے اور وہ تڑپ رہا ہے تو رستم کیکاؤس کے پاس آدمی بھیجکر نوشدارو طلب کرتا ہے۔ کیکاؤس دینے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ رستم کیا کم ہے۔ اگر باپ بیٹا دونوں مل گئے تو پھر کسی بادشاہ کا رہنا دشوار ہو جائیگا۔ دکنی شاہنامے میں یہ حصہ بالکل ترک کر دیا ہے۔

نظم کی پہلی داستان جو زال زر (پسر رستم) کے متعلق ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سخن سنجو سخنداں سخن دانان — کہ شہنامے کی ہے یو داستاناں
کہ او بیدار دل نامی پہلواں — کہ کیتے سال بعد از اپنی ٹھاواں
اپس محبوب سے رہتے تھے خوشدل — یکایک حق دیا امید کا پھل

اگرچہ ان داستانوں کو پورا ترجمہ نہیں کہہ سکتے لیکن پھر بھی بعض مقامات پر مصنف نے فردوسی کے اشعار کا پورا پورا ترجمہ کر دیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ نیز اس سے اس کتاب کی زبان کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا۔

اصلی اشعار	ترجمہ
پسندش نیامد چناں آرزوی	پہلواں کو پسند ہرگز نہ آیا
دگرگونہ بایستش اورا بجوی	غصے سے خون جگر میں جوش کھایا
چو مرغ ژیاں باشد آموزگار	کہ جب کا مرغ ہوگا پرورش کار

اصل اشعار	ترجمہ
چنیں کام دل جوید از روزگار	کہاں انسان کے آویں اس میں آثار

سپہبد چنیں گفت باماہ رو	پہلواں کہے یوں حور سوں پھر
کہ اے سرو سیمیں پُر از رنگ و بو	سُنے یوں سام یا شاہِ منوچہر
منوچہر گر بشنود داستاں	دیا ہوں دل جو میں سہراب کے گھر
نباشد بدیں کار ہم داستاں	کہ شاہ ہو سام برو سا ویں گے قہر
ہماں شام بزم برآید بجوشش	میں اپنی جان سے گزروں گا یکبار
کف اندازد و برمن آرد خروش	کہ جان کون دے کے میں ہوں گا خریدار
ولیکن سرمایہ جاں است و تن	ولیکن حق کنے زاری کروں گا
ہمی خوار گیرم بپوشم کفن	میں دو نینوں سے خوں جاری کروں گا
شوم پیش یزداں نیایش کنم	کہ شاہ اور سام کے دل کی کدورت
چو ایزد پرستاں ستائش کنم	نکل جاوے دلادیں یہ مراجعت
مگر کو دل سام و شاہ زمیں	
بشوید ز خشم و ز بیداد کیں	

جب سہراب زخمی ہو کر تڑپ رہا ہے تو رستم سے کہتا ہے کہ میرا باپ تجھ سے اس کا انتقام لے گا اور زندہ نہ چھوڑے گا خواہ تو اُڑ کر آسمان پر جا پہنچے یا سمندر کی تہ میں۔

کنوں گر تو در آب ماہی شوی	اگر ماہی ہو کر دریا میں جاوے
دیا چوں شب اندر سیاہی شوی	پرندہ ہو کہ تو آسماں پو جاوے
دگر چوں ستارہ شوی بر سپہر	کسی حکمت سوں اپنے کو چھپاوے
ببری ز روے زمیں پاک مہر	مرا ہے باپ ایسا ڈھونڈ لاوے

بخواہد ہم از تو پدر کین من	گرامی ناماں سوں کوی اکثر
چو بیند کہ خاکست بالینِ من	کہ البتہ کریں رستم کون جا خبر
ازیں نامداراں و گردن کشائی	
کسے ہم برد سوئے رستم نشاں	

سہراب کی ماں کو جب رستم کے ہاتھوں بیٹے کے قتل ہونیکا حال معلوم ہوا تو اس کی دردناک حالت اور ماتم کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان حالات کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اس زمانے میں اُس خطے" والے اور خاص کر مائیں ماتم میں کیا کر گزرتی تھیں۔ دکنی زبان کے مصنف نے بھی بعض بعض اشعار کے ترجمے کی کوشش کی ہے۔

برآورد بانگ و غریو و خروش	کہ سنتے ویں گیا تن سے نکل ہوش
زماں تا زماں زد ہمی رفت ہوش	دیوانی ہوئی عقل کوں کر فراموش
بزد چنگ و بدرید پیراہنش	کہ نعرہ مار گریباں کو کیے چاک
درخشان شد آں لعل زیبا تنش	زمیں پر گر کو سر پہ ڈالنے خاک
فرو برد ناخن و دیدہ بکند	دونوں انکھاں کوں اپنی وہ نکالی
برآورد بالا در آتش فگند	اگیٹی میں دونوں انکھاں کو ڈالی
مرآں زلف چوں تاب دادہ کمند	
بانگشت پیچیدہ از بُن بکند	
رواں گشتہ از لعلے او جوے خوں	کہ بالاں سارے توڑی مارتے موں
زماں تا زماں اندر آمد نگوں	کہ سر سے تا قدم تھی غرق در خوں
بسر بر فگند آتش و بر فروخت	اگیٹی آگ بھر ڈالی وہ سر پر
ہمی موئے مشکیں باتش بسوخت	جلائی سر کے بالاں وہ سراسر
دو چشم برہ بود گفتم مگر	دونوں آنکھا بندی تھی رہ کے اوپر

ز سہراب و رستم بیابم خبر
چہ دانستم اے پور کاید خبر
کہ رستم بہ خنجر دریدت جگر
دریغش نیامد ز آں روئے تو
ازاں برز و بالا و بازوئے تو
وزاں گرد و گاہش نیامد دریغ
کہ ببرید رستم بہ بُرّندہ تیغ
بہ پروردہ بودم تنش را بہ ناز
بر خشندہ روز و شبانِ دراز
کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت
کفن در تن پاکِ او خرقہ گشت
کرا گویم ایں درد و تیمار خویش
کرا خوانم اکنوں بجائے تو پیش
چرا نامدم با تو اندر سفر
کہ گشتی بہ گردان گیتی سمر

کہ باپ بیٹے ملے بولے کوئی آکر
میں خوش وقت تھی جو اپنے دل کے اندر
بخانی مارے گا رستم یو خنجر
دریغ آیا نہیں ہے بے کٹر کوں
کہ ایسے شیر کوں مارا خنجر سوں
کہ کس محنت سے پالی تھی دل افروز
کہ یکساں تھا مرے حق میں شب و روز
کہ کیسا غرقِ خوں میں اے پہلواں
جمال خوش ہوا در خاک یکساں
کہاں دیکھوں گی اب دیدار تیرا
کہوں کس سات درد دل یو میرا
سفر میں کیوں نہ گئی تجھ سات آ نور
کہ پہچانتا مجھے رستم یوا ز دور

جب سہراب نے اپنے باپ کا نام و نشاں بتایا اور مُہرے کا پتا دیا جو اس کے بازو پر بندھا ہوا تھا تو اس موقع کے چند اشعار کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

جو بکشاد خفتاں آں مہرہ دید
ہمی جامہ بر خویشتن بر درید
ہمی گفت کاے کشتہ بر دستِ من
دلیر و ستودہ بہر انجمن
ہمی ریخت خوں و ہمی کند موئے

کہ بازو کھول کر دیکھا جو مہرا
لگا ڈالنے کو خاکاں کر کو نعرا
کہ اپنے ہاتھ سے مارا گیا شیر
کہ جس کے دھاک سوں شیراں بی سب زیر
ایسا مارتے تھے رستم تن بدن پر

سرش پُر ز خاک و پُر از آب روئے　　　که زره نے ہی باقی رہی تھی تن پر
بدو گفت سہراب کایں بد بر بیست　　　کہے سہراب اب کیا فائدہ ہے
بآب دو دیدہ نہ باید گریست　　　کہ اپنے بر یو کرتا توں روا ہے

اسی طرح بعض اور اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً

یکے دشنہ بگرفت رستم بدست　　　کہ رستم ہاتھ میں لے کر وہ خنجر
کہ از تن ببرد سر خویش پست　　　کہ چھیتے مارنے اپنے جگر پر
ہمی گرز بارید بر خود و ترگ　　　کہ دیواں جھڑتے تھے مازندراں کے
کہ باد خزاں بارد از بید برگ　　　کہ جیسے پات گرتے ہیں خزاں کے

ان داستانوں کے کل اشعار ۲۹۲۴ ہیں۔ افسوس کہ مصنف کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ دکنی مخطوطات میں کہیں اس کا نام نہیں۔ اور اس نے کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں کیا۔ اور نہ اس کا سنہ تصنیف معلوم ہو سکا۔ زبان پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی کی نصف آخر کی تصنیف ہے۔ اس کے دکنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کتاب کے خاتمے پر وہ خود اس کا اقرار کرتا ہے۔

کہ شہنامے کی کیتی داستاں کوں　　　سہج ہوتا کہی دکھنی زباں سوں
حقیقت زال کی رستم و برزو　　　کیا ہوں مختصر دکھنی منے یو
ختم نامہ یو رستم داستاں کا　　　و برزو ہور رستم پہلواں کا
بحق مصطفےٰ ہور چار یاراں　　　کہ در پر نت رہے ہے رحمت کا باراں
سُنن ہاروں کوں بی نت ہوئے رحمت　　　کھو سب در کا رہے ایماں سلامت

قدیم دکنی اُردو کی جو خصوصیات ہیں وہ تقریباً سب اس میں موجود ہیں۔ جمع کا طریقہ، افعال اور ضمائر کی صورتیں سب وہی ہیں۔ قوافی میں بھی بعض جگہ حرف صوت کا یا مقامی لہجے کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً

یکایک یو خبر گئی ہے جو شہ پاس　　　کہ مہراب ہور زال میں بھوت اخلاص

اگر کوں سر بسر یو بدا ہے بات   یو سُن آزدہ ہوے لگا اسی ساعت

اور ایک جگہ تو قافیے میں کمال کر دیا ہے۔

کہا شہ زال یل کے کھول طائع   تمہی معلوم جیسا اِس کوں پالے

(رسالہ "اردو" اکتوبر ۱۹۴۹ء)

اُردو زبان کا ایک قدیم کتبہ

اسلامی عہد کی قدیم عمارتوں پر اکثر کتبے فارسی زبان میں ہیں اور قدیم عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے، بہت سی حال کی عمارتوں پر بھی فارسی کتبے نظر آتے ہیں۔ عموماً کتبے اس وقت تک کسی زبان میں نہیں لکھے جاتے جب تک اس کا رواج عام نہ ہو۔ فارسی . . . کا رواج اس ملک میں جیسا کچھ تھا اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں کے طبیب اب تک اپنے نسخے فارسی میں لکھتے ہیں۔ رواج بہت سخت جان ہوتا ہے۔ یہ مٹتے ہی مٹتے مٹتا ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے بعض قدیم عمارتوں پر قدیم اُردو یا ہندوستانی زبان کے کتبے نظر آئے۔ اس زبان کا سب سے قدیم کتبہ مجھے احمد آباد کی ایک چھوٹی سی مسجد میں مِلا۔

سب سے پہلے شمالی ہند سے ہندستانی زبان گجرات اور دکن میں پہنچی اور وہیں اسے ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔ علاؤالدین خلجی نے ۶۹۶ ہجری میں گجرات پر تسلط کر لیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کر دیا۔ صوبیدار کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا،

یہاں تک کہ جب دہلی پر تیمور کا لشکر پہنچا اور وہاں کی حکومت میں ضعف آگیا تو صوبیدار ظفر خاں کے بیٹے تاتار خاں نے خود اپنی حکومت قائم کرلی اور محمد شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھ گیا (۸۰۶ ہجری) خلجیوں کے تسلط اور تغلقوں کے زمانۂ حکومت میں علاوہ لشکر کے ہر پیشے اور ہر مشرب کے لوگ دلی سے گجرات پہنچے اور ان کی زبان دکن کی طرح گجرات میں بھی رائج ہوگئی۔ شاہانِ گجرات کی حکومت اکبر کے عہد تک رہی۔ اس کے بعد گجرات کا صوبہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ غرض دہلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے زمانے سے لے کر آخر تک رہا۔

لیکن حکومتوں اور بادشاہوں سے بڑھ کر فقرا۔ اور صوفیا نے کام کیا جو اس زمانے میں، بلکہ اس سے قبل وہاں پہنچ گئے تھے۔ صوفیا کا مسلک صلح کل ہوتا ہے اور وہ اپنے پیغام کی تلقین اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی طرف ایک کشش سی ہوتی ہے۔ منجملہ اور طریقوں کے جو وہ اس غرض کیلئے استعمال کرتے تھے ایک یہ بھی تھا کہ باوجود صاحب علم وفضل ہونے کے وہ تلقین وتعلیم عام لوگوں کی زبان میں کرتے تھے۔ اگرچہ زبان وادب کی اشاعت سے براہِ راست انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ ان کی تعلیم کسی خاص طبقے یا فرقے سے مخصوص نہیں ہوتی اور ان کا فیض عام ہوتا ہے بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور طالب فیض ہوتے ہیں، اس لئے ان کے سمجھانے کے لئے انھیں کی زبان میں ان سے باتیں کرتے اور انھیں کی زبان میں تعلیم وتلقین کرتے تھے۔ گجرات ودکن میں ان کی بدولت اس زبان کو جسے ہم آج کل اُردو یا ہندوستانی کہتے ہیں بہت کچھ فروغ ہوا۔

گجرات کے ان بزرگوں میں سے بعض کا کلام اور حالات ہم تک پہنچے ہیں۔ مثلاً حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ ہجری، وفات سنہ ۸۵۰ ہجری) اور ان کے فرزند حضرت شاہ عالم (ولادت ۸۱۷ ہجری، وفات سنہ ۸۸۰ ہجری) اپنے زمانے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کے متعدد ہندی اقوال اب تک محفوظ ہیں۔

شیخ وجیہ الدین احمد علوی، احمد آباد کے بڑے عالم اور صاحبِ باطن بزرگ تھے

(سنہ ۹۱۰ ہجری، سنہ ۹۹۸ ہجری) ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں جس کا نام سحر الحقائق ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں۔

سید شاہ ہاشم (متوفی ۱۰۵۹ھ) گجرات کے مشہور اولیا میں سے ہیں۔ آپ کے ایک خاص مرید نے آپ کے اقوال وغیرہ ایک کتاب میں جس کا نام "مقصود المراد" ہے جمع کئے ہیں۔ اس میں جابجا کثرت سے شاہ صاحب کے ہندی اقوال و ابیات و نظمیں درج ہیں

ایسے اور بہت سے بزرگ ہیں جن کے ہندی اقوال وغیرہ ہم تک پہنچے ہیں لیکن ان بزرگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا مستقل مرتب کلام بھی موجود ہے۔ مثلاً قاضی محمود دریائی کا مکمل دیوان محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی ابتدائی صورت کیا تھی۔ قاضی صاحب کا سنہ وفات ۹۴۱ ہجری ہے۔ دوسرے بزرگ شاہ علی محمد جیو گام دھنی ہیں جن کے دیوان کا نام "جواہر اسرار الٰہیہ" دیوان کے مرتب شاہ صاحب کے ایک معتقد ہیں جو اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "بطریق نظم با الفاظ گوجری بزبان مبارک خود فرمود" گوجری سے یہاں وہی زبان مراد ہے جو دلی سے آکر گجرات میں رائج ہوئی اور اس میں گجراتی کی آمیزش ہوئی۔ قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو کے کلام میں خاص گجراتی زبان کے الفاظ اکثر آتے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں وہ ہندی اور گجراتی کی آمیزش ہے جس میں کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ بھی آجاتے ہیں شاہ صاحب کا سنہ وفات ۹۷۳ ہجری ہے۔

ایک تیسرے صاحب تصنیف بزرگ میاں شیخ خوب محمد چشتی ہیں۔ وہ اپنی زبان کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ "من بزبان گجرات کہ بہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام" ان کی زبان قدیم گجراتی اردو کا اچھا نمونہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کہیں کہیں کوئی خاص گجراتی لفظ آجاتا ہے وہ اچھی خاصی پرانی اردو ہے۔ جس میں ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی عربی کے لفظ بلا تکلف استعمال کئے گئے ہیں۔ نسبتاً ان کا کلام بہت صاف اور سلیس ہے۔ ان کا سنہ وفات ۱۰۲۳ ہجری ہے۔

یہ مختصر سی تمہید میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ زبان کی ابتدائی صورت ذہن میں رہے دوسرے جو کتبہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق بھی ایک گونہ انھیں بزرگوں میں سے ایک سے ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ کتبہ جس کا چربہ آپ کے سامنے ہے احمد آباد کی مسجد رائے کھڈ میں ہے۔

یہ مسجد شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے مزار کے مغرب جانب کم و بیش پچاس قدم کے فاصلے پر اسی احاطے میں ہے۔ اس مسجد کی تعمیر بالکل مختصر سی ہے۔ مینار اپنی طرز کے اچھے ہیں۔ مسجد میں چھوٹا سا صحن ہے اور اس کی قبلہ رو دیوار میں تین محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک ایک کتبہ ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ درمیانی کتبے پر یہ آیت ہے

"وان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احداً"

۲۔ داہنی جانب کا کتبہ۔

"محمد الرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"

یہ شجرہ طیبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے آخر میں سنہ محمدی وستین وتسعمانہ یعنی ۹۶۱ ہجری ثبت ہے۔

۳۔ تیسرا کتبہ جو بائیں طرف ہے وہ اصل مقصود ہے۔ اس کے اوپر کے حصّے میں احمد شاہ بادشاہ گجرات کا شجرہ ہے جس کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے نیچے دو شعر پرانی اردو یا ہندوستانی میں ہیں جن کے آخری مصرع سے تعمیر مسجد کا سنہ تاریخ نکلتا ہے۔ اوپر کی تین سطروں میں بادشاہ کا شجرہ یہ ہے۔

(۱) المعتصم باللّٰہ الرحمن غیاث الدنیا والدین ابوالمحامد احمد شاہ۔

(۲) ابن عم محمود شاہ بن لطیف شاہ اخ بہادر شاہ بن مظفر شاہ بن محمود شاہ۔

(۳) ابن محمد شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد ملکہ۔

آخری دو سطروں میں یہ دو شعر ہیں۔

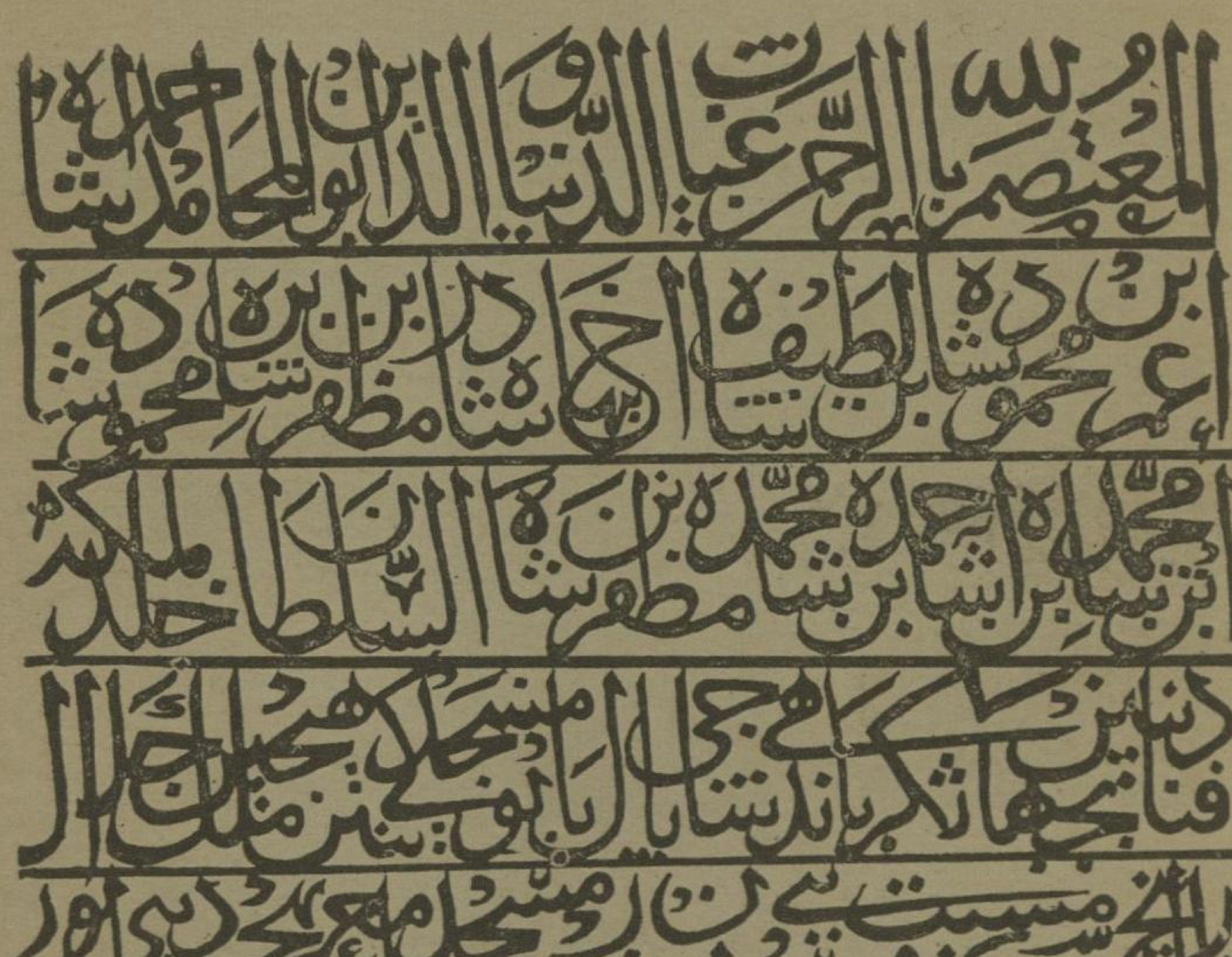
فناد نیں سمجھا نکر باندھے شاجی پال   بانو مسجد کے تئیں بیچیں ملک جلال

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سوئیوں مشہور   مسجد جامع کے بیچ ڈھایا یے لوز

آخری مصرع سے سنہ ۹۶۳ ہجری نکلتا ہے۔

احمد شاہ گجرات کے آخری بادشاہ سلطان بہادر مظفر نو کا پیشرو تھا۔ اس کے بعد سلطنت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں اپنے امرا کے ہاتھ میں مثل کٹھ پتلی کے تھے۔ احمد شاہ سنہ ۹۶۱ ہجری میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۹۶۸ ہجری میں قتل کردیا گیا۔ یہ مسجد اسی کے زمانے میں تعمیر ہوئی اور اس پر جو کتبہ ہے اس زمانے کی اُردو کا نمونہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتبہ بہت قابلِ قدر ہے اور اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ زبان جسے ہم اُردو یا ہندوستانی کہتے ہیں ملک کے اطراف وجوانب میں صدیوں پہلے پوری طرح پھیل چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں کتبے تک لکھے جاتے تھے۔

(رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۳۸ء)



اردو کا قدیم ترین کتبہ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد نجات ہی کرو اسپر تمام

کیلی ہی اللہ نے کھل کی تیں

حکم اسیکا ہی سبہی حکم پر

نور خدا کا ہی جہان نور ہے

اونچا نیچا جب نتہا تب آپ تہا

کیلی ہی سب کچ کا جو کیتا حکیم

نام خدا لی کرو ختم کلام

نام خدا فرح ہی دل بہل کی تیں

ہی الف اللہ نہ زیر و زبر

ایک آپی سب منیں بھر پور ہے

ہی سو نہ اچھسی وو اچھیگا سدا

دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ کا ابتدائی ورق

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا۔ لیکن وہ بات چیت، کام کاج، سودا سلف تک محدود رہی۔ اہلِ علم نے اسے کبھی منہ نہ لگایا اور اس لئے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھکھیڑ نہ اُٹھائی۔ سب سے اوّل ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی اور گروہ عوام سے نکل کر مجلس خواص میں آئی۔ شعرائے دکن جنکی تخئیل کی جولانگاہ فارسی زبان تھی، اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہے گا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی۔

اس امر کو ہمارے ہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندۂ دکن کا تھا

قائم کہتے ہیں۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اِک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اس میں دکنی زبان کی اس قدر تنقیص مقصود نہیں جس قدر اپنی تعلّی منظور ہے۔ ایک

جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ　　　　عمر بسر ہندی ہی نہیں کچھ یہ ریختہ

ایک زمانہ تک یہ خیال رہا کہ ولی اردو کا پہلا شاعر ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مگر تعجب ہے کہ باوجود غلطی تسلیم کرنے کے اب بھی بعض تذکرہ نویس ولی کو اُردو شاعری کا آدم کہتے ہیں۔ معلوم نہیں آدم سے ان کا کیا مطلب ہے۔ اگر آدم سے مطلب یہ کہ وہ پہلا انسان ہے جو تمام بنی نوع انسان کا مورث اعلیٰ ہے تو یہ خیال صریحاً غلط ہے کیوں کہ ولی سے بھی پہلے دکن میں اُردو شاعر ہوئے ہیں۔ اور اگر آدم سے وہ پہلا انسان مراد لیا جائے جس کا علم ہمیں پہونچا ہے (گو ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی انسان...... ہوئے ہوں مگر ہمیں ان کا علم نہیں) تو بھی یہ خیال صحیح نہیں۔ چونکہ ولی سے پہلے جو شاعر ہوئے ہیں ہمیں ان کا علم ہے اور ان کا کلام بھی موجود ہے۔ غرض اس خیال کی نوبت عقیدہ تک پہنچ گئی ہے کہ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی قلم اور زبان سے نکل جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا خیال قائم ہوا جو اب تک صحیح سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ولی اردو کا پہلا شاعر نہیں ہے تاہم وہ پہلا شخص ہے جس نے غزل کو فارسی رنگ میں لکھا اور جس نے اپنا دیوان فارسی دیوانوں کے طرز پر ردیف وار مرتب کیا ہے۔ تحقیق نے جو غلطی کی گھات میں لگی رہتی ہے پھر اس خیال کو نہ چلنے دیا معلوم ہوا کہ ولی سے پہلے بھی شعرائے دکن نے اس رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور مروجہ طرز پر اپنے دیوان مرتب کئے ہیں اس کا بین ثبوت سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات ہے جسے آج ہم ناظرین اُردو سے روشناس کرنا چاہتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کا شاعر اور اکبر کا ہم عصر ہے۔ جہاں تک تحقیق نے رسائی کی ہے یہ کلام اُردو میں سب سے قدیم ہے۔ بعض مذہبی مثنویاں اس سے پہلے کی بھی پائی جاتی ہیں، لیکن تغزل کے کوچے میں کسی دوسرے مسافر کا پتہ اب تک نہیں لگا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم



سلطان محمد قلی قطب شاہ

ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی کلام اُردو کا نہیں ہے۔ اس حد تک پہونچنے کے لئے ضرور ہے کہ اس سے پہلے بہت سے عاشق مزاجوں اور موزوں طبع لوگوں نے صرف شعر کی کوچہ گردی کی ہو اور اپنی مشاقی اور طبع آزمائی سے غزل، مثنوی، قصیدے اور دیگر اصنافِ سخن کو اس درجہ تک پہونچایا ہو جو ہم محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں دیکھتے ہیں افسوس ہے کہ ان قابلِ قدر بزرگوں اور اردو کے سچے محسنوں میں سے کسی کا کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ جستجو انھیں ڈھونڈ نکالے اور ہمارے علم و تحقیق میں اضافہ کرے۔ وہ وقت بھی کیسا عجیب اور پُر اسرار ہوگا جب کہ زبان پہلی بار تقریر سے نکل کر تحریر میں سماتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ کوئی لڑکپن سے نکل کر بلوغت کی سرحد میں اوّل قدم رکھتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آیا۔ خود اسے بھی نہیں معلوم ہوتا جس پر گزرتی ہے۔ وہ عجیب آن ہے جو نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ بیان میں سما سکتی ہے۔ بعینہ یہی حال زبان کا ہے وہ آوازیں جو پہلی بار حروف میں منتقل ہوئیں ہمیشہ سے نظر سے پوشیدہ رہیں گی۔ لیکن زبان کا مورخ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر نقشِ اوّل نہیں تو نقشِ ثانی تو کہیں ضرور مل رہیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دل کش انسانی آوازیں سینوں میں محفوظ رہتی ہیں اور ارثاً ایک نسل سے دوسری نسل کو پہونچتی ہیں۔ لیکن اُردو کو وہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان اُردو نہیں۔ اس لئے ابتدائی اُردو سینوں میں نہیں سفینوں تلاش کرنی پڑے گی۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری کی زبان کا پتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے لگتا ہے۔

یہ کلیات ایک نہایت قابلِ قدر اور نادر نسخہ ہے۔ بڑی تقطیع اور اعلیٰ درجہ کے قدیم کاغذ پر بخط نسخ بہت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ کتاب بہت ضخیم ہے تقریباً اٹھارہ سو صفحے ہوں گے۔ اسے محمد قلی قطب شاہ کے جانشین اور بھتیجے محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام اور خلوص سے ترتیب دیا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانہ کا ہے اور سرِ ورق پر خود محمد قطب شاہ کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ہے (ملاحظہ ہو تصویر)

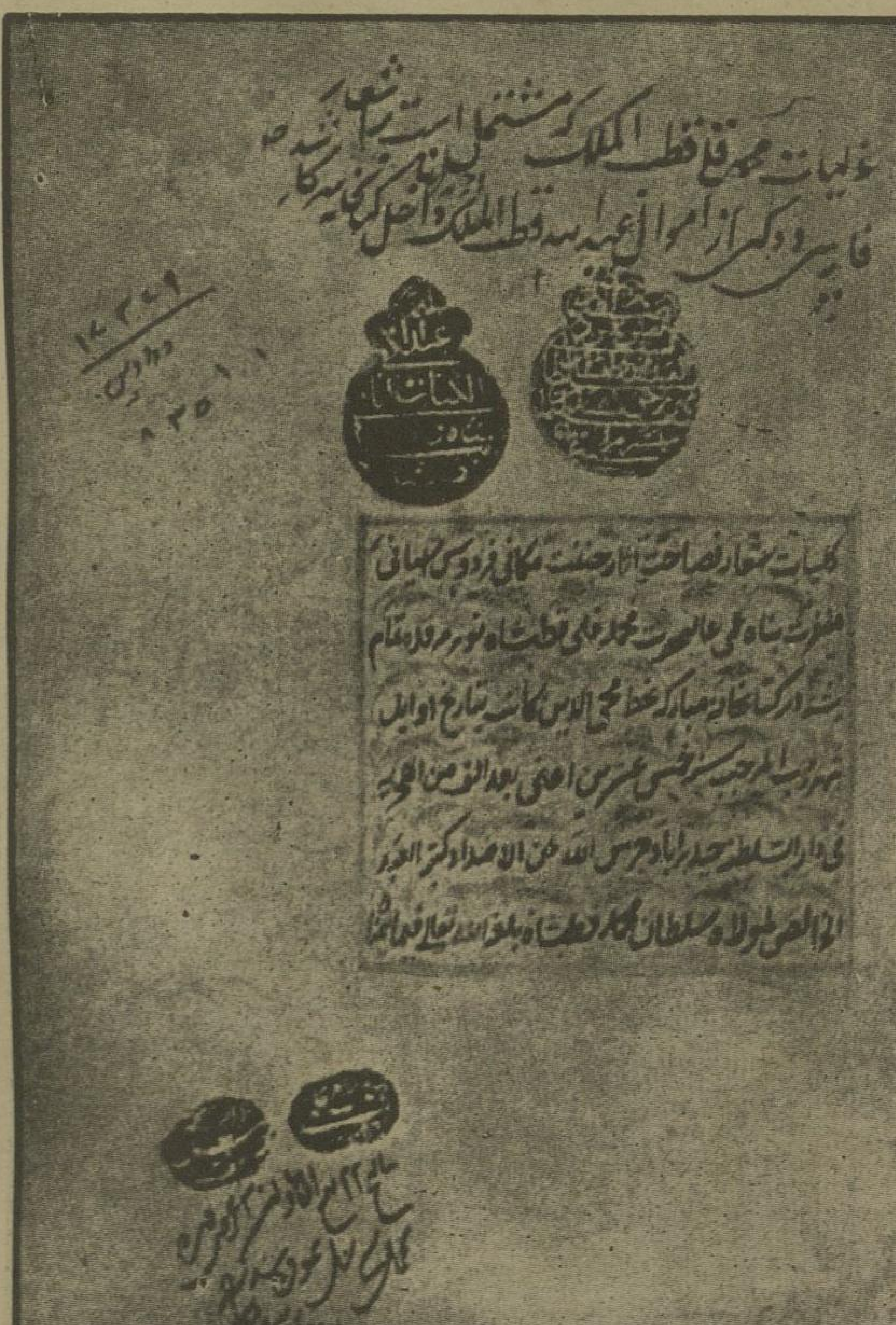
دونوں چچا بھتیجے صاحب علم، صاحب ذوق اور صاحب دیوان ہوئے ہیں۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد قطب شاہ کی عادت تھی کہ کتاب پڑھنے کے بعد اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اپنے قلم سے لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اس تصویر میں کلیات جامی پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار کا فوٹو دیا گیا ہے۔ دونوں تحریروں کا ایک خط اور ایک قلم ہے۔ اس تحریر کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ فوٹو میں درج ہے اور اگرچہ عکس اصل سے چھوٹا ہے تاہم عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔ اس تحریر کے اوپر ورق کے سرے پر جو عبارت لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاص کتب خانہ شاہی کا ہے۔ ان دونوں عبارتوں کے درمیان محمد قطب شاہ کی مہر ہے۔ مہر کی تحریر پڑھنا ذرا مشکل ہے اس لئے وہ نقل کی جاتی ہے۔

مہر سلیمان ز حق گشتہ میسر مرا گشت ز نقش نگیں حیدر صفدر مرا

اور ان دونوں مصرعوں کے بیچ میں "العبد سلطان محمد قطب شاہ" لکھا ہے۔ صفحہ کے آخر میں بائیں طرف کتب خانہ میں داخلہ کی تاریخ ہے اور اس کے نیچے "تحویل شمس لعل نمودہ شد" تحریر ہے اور اس کے نیچے خفی قلم سے "باقی الحال تحویل شمس الدین نمودہ شد" لکھا ہے۔ صفحہ کے اوپر کے حصہ میں مہروں کی بائیں جانب کتب کی تعداد بھی درج ہے جس سے کتب خانہ کی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ کتب خانوں کی رونق صرف کتابت کے فن شریف پر منحصر تھی۔ کتابت کا سنہ خود قطب شاہ نے اپنی تحریر میں ۱۰۲۵ ہجری بتایا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کیا تو شاہی کتب خانہ سے بعض کتابیں بھی دوسرے مال غنیمت کے ساتھ دلی چلی گئیں۔ اور جب دلی پر آفت آئی اور وہاں کا کتب خانہ برباد اور غارت ہوا تو یہ کتاب پھرتے پھراتے کلکتہ پہنچی اور کلکتہ آخر پھر... اپنے اصل مقام یعنی حیدرآباد پہنچ گئی۔ صفحہ کے شروع میں جو یہ عبارت لکھی ہے "غزلیات محمد قلی قطب الملک کہ مشتمل است بر اشعار فارسی و دکنی از اموال عبداللہ قطب الملک در حیدرآباد داخل کتب خانہ سرکار شد"۔ اس کی شان تحریر سے صاف ٹپکتا ہے کہ یہ فدویان شہنشاہ دہلی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔



قلمی دیوان حضرت جامی رح کے سرورق پر
سلطان محمد قطب شاہ کی تحریر



سلطان محمد قطب شاہ کی تحریر

اپنے چچا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دیوان پر

اور سرکار سے مراد سرکار شاہان مغلیہ ہے۔ حیدرآباد کی سرکار میں کوئی شخص محمد قلی قطب الملک اور عبداللہ قطب الملک کے نام بغیر آداب والقاب کے اسطرح بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ باوجود ان حوادث وانقلابات کے یہ کتاب صحیح وسالم بچ گئی اور پھر وہیں آگئی جہاں سے گئی تھی۔

کتاب کے بے بہا نادر اور مستند ہونے میں مطلق کلام نہیں ہو سکتا۔ صحت کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کتابت میں صحت کا امکان ہو سکتا ہے اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ خط بے نظیر ہے مگر نسخ ہے۔ کاتب نے بے شک لکھنے میں اپنا کمال دکھایا ہے لیکن یہ بزرگ عربی خط لکھتے لکھتے یہ بھول گئے کہ یہ ہندی کتاب ہے اور ہندی میں بعض حروف ایسے ہیں جو عربی میں نہیں اور جن کے ظاہر کرنے کے لئے خاص علامتیں ہیں چنانچہ وہ بعض اوقات ڈ اور د۔ ر اور ڑ۔ ج اور چ۔ ک اور گ نیز ب اور پ میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ ہندی کتاب کو نسخ میں پڑھنا ویسے بھی مشکل ہے اور جب رسم الخط کی دشواری بھی ہو تو مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے پھر جگہ دو لفظوں کو ملا کر اس طرح لکھ دیتا ہے کہ بغیر غور وفکر کے اس قسم کے لفظ صحیح نہیں پڑھے جاتے۔ اول تو زبان قدیم اور اس پر خط اور طرز تحریر کی دقت اس لئے جب تک پہلے سے کوئی زبان سے واقف نہ ہو، اس کا صحیح پڑھنا آسان کام نہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے پامال السنہ رہا ہے سنسکرت سے لے کر انگریزی تک کوئی نہ کوئی غیر السنہ زبان اس پر مسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گولکنڈہ میں تھی جہاں کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اور رعایا کی زبان تلنگی۔ یہی حال عادل شاہوں کا بیجاپور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی۔ یہ دونوں زبانیں دراوڑی ہیں اور انھیں آریائی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک میں جب اُردو نے ادبی صورت اختیار کی تو اس کے خط وخال کیا ہوں گے۔ تلنگی اور کنڑی دونوں اجنبی اور غیر مانوس، ان سے کسی قسم کا میل ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ فارسی کا رنگ پر چڑھ گیا۔ اوّل تو فارسی آریائی دوسرے صدہا سال

کی یک جائی ۔ دونوں ایسی گھل مل گئیں جیسے شیر و شکر ۔ تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل، اردو میں بھی بلا تکلف آ گئے ۔ الفاظ، تشبیہات، استعارات بنے بنائے تیار مل گئے ۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے اور قصیدے، مثنوی، رباعی اور غزل میں وہی شان آ گئی جو فارسی میں پائی جاتی ہے ۔ لیکن سب سے بڑا انقلاب جس نے اُردو ہندی میں امتیاز پیدا کر دیا ۔ وہ یہ تھا کہ عروض میں بھی فارسی ہی کی تقلید کی گئی اور بغیر کسی تغیر و تبدل کے اسے اُردو میں لے لیا ۔ فارسی نے اسے عرب سے لیا تھا، اُردو کو فارسی سے ملا ، اگر اُردو (ریختہ) کو ادبی نشو و نما دکن میں حاصل نہ ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ بجائے فارسی عروض کے ہندی عروض (پنگل) ہوتا ۔ کیونکہ دوآبہ گنگ جمن میں آس پاس ہر طرف ہندی تھی اور ملک کی عام زبان تھی ۔ بہ خلاف اس کے دکن میں سوائے فارسی کے کوئی اس کا آشنا نہ تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ فارسی اس پر چھا گئی ورنہ یہ جو تھوڑا سا امتیاز اُردو ہندی میں پایا جاتا ہے وہ بھی نہ رہتا ۔ اور غالباً یہ اردو کے حق میں بہت بہتر ہے ۔

میں نے ابھی یہ لکھا ہے کہ اِس کلیات کے شروع میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے ایک منظوم دیباچہ لکھا ہے ۔ اس دیباچہ میں اول اس نے یہ بتایا ہے کہ ان نظموں کو کس ترتیب سے درج کیا گیا ہے اوّل مثنویاں پھر قصیدے، اس کے بعد ترجیع بند، ترجیع بند کے بعد فارسی مرثیے، اس کے بعد دکھنی مرثیے ۔ دکھنی مرثیوں کے بعد فارسی غزلیں ، فارسی غزلوں کے بعد دکھنی غزلیں، اور سب سے آخر میں رباعیات اِس کے بعد وہ کہتا ہے ۔

بجد ہو کے ظل آلہی نول[1] — پرے شعر تا پائیں کر خط سگل[2]
آپس دل میں کر فکر سب ایک بات — کئے خطبہ کہہ مستعد کلیات
جو الحق سنے کوئی اگر یہ زباں — تو در حال کہیں[3] مرحبا بے گماں

---

[1] نادر [2] سب [3] کہیں۔

سو کچ شاعری بیچ شہ و ہر کمال ‏ بچن[1] کہہ کہ موتیاں نمن[2] عدد ڈھال
کہے نین کہیں[3] شعر میں وصف الپس[4] ‏ جو اچہ شعر کے فن میں اتیا[5] سرس[6]
جو بھی کوئی اچھے[7] شاعراں دھات[8] دو ‏ تو بن وصف الپس کے نرہے[9] سات دو
اگر کم تو پچاس ہیں بیت چار ‏ نہے باج الپس وصف تہیں سنگھار
رہیا جائے ناشاعراں ممنیں ‏ بن[10] آ کہے صفت شعر کے ممنیں
جو خاصا ہے یو شاعراں کا ہر ایک ‏ نرین بن کہے وصف بتیاں کتک
مگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار ‏ دہرے وصف آلپس سو کہیں بیت عار
دتا[11] شعر کہہ بیت میں نیک بات ‏ کہی نیں کہیں آپنے وصف سات
جو مقطع میں ہر یک الپس شعر کے ‏ لئے بن سو حضرت علی نالوں[12] اپے
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام ‏ بغیر از علی کا لئے باج نام
کہے وصف شہ کا اگر تو جتا[13] ‏ تو وصف میں شاہ کے کم دتا
تو اب ختم خطبے کوں ظل الہ ‏ کئے منگ[14] علی ولی تھے پناہ

ظل اللہ محمد قطب شاہ کا تخلص ہے۔ اس مقدمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں اور علاوہ فارسی دکھنی کے تلنگی میں بھی ان کا کلام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کہیں شاعرانہ تعلی نہیں کرتے اور مقطع میں ہمیشہ تبرکاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام لاتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ خاص کر شعر و شاعری کے چرچے ایران سے لے کر ہندوستان تک یکساں تھے بلکہ ہندوستان کا قدم کچھ آگے ہی تھا۔

شعر و سخن ہماری معاشرت و اخلاق اور ہمارے علم و فضل کا بہت بڑا جز تھے

---

۱ کلام ۲ مانند ۳ نہیں ۴ اپنا ۵ اتنا ۶ کمال ۷ ہو یا ہے ۸ قسم طرح ۹ نہ رہے ۱۰ کہے ۱۱ اتنا ۱۲ نام ۱۳ جتنا ۱۴ مانگ

اور ہر شخص جو شرافت کا دعویٰ رکھتا تھا شعر و سخن کا بھی مدعی تھا۔ شمال میں اکبر کے دربار میں ابو الفضل جیسے اعلیٰ انشا پرداز اور فیضی و عرفی سے زبردست شاعر موجود تھے جن کا کلام ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اکبر نے ہندی کی بھی سرپرستی کی اور بیربل مان سین اور خانخاناں کا ہندی کلام اب تک موجود اور مروج ہے۔ شاہانِ دکن نے فارسی کے ساتھ دکنی (قدیم اُردو) کی بھی ویسی ہی قدردانی کی جو..... قدیم اُردو کے ابتدائی عروج کی پہلی بنیاد ہے۔ ہمارے بادشاہ صرف شعر و سخن کے قدرداں و سرپرست ہی نہیں تھے بلکہ خود بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ اکبر اگرچہ اُمّی تھا مگر اس سے بھی بعض شعر منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کا تھا۔ تاریخوں میں ان بادشاہوں کے نام سے بھی اشعار درج ہیں۔ لیکن ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نمبر سب سے اول تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ اس قدر ضخیم ہے کہ بادشاہ شاعر تو کیا پیشہ ور شاعر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جن کے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اردو کلام پر ہے انھیں سلطان محمد قلی شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی نظر نہیں آئے گی۔ نہ انھیں الفاظ کی نشست اور ان کی باہمی ترکیبوں میں کوئی خوبی معلوم ہوگی اور نہ طرزِ ادا میں (جس پر کلام کی خوبی کا بہت کچھ انحصار ہے) کچھ زیادہ لطف آئے گا۔ اس میں سراسر شاعر ہی کا قصور نہیں پڑھنے والے کا بھی ہے۔ اس کے پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کر دینی چاہئے کہ یہ اُردو کا قدیم ابتدائی کلام ہے جس کے قبل کا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر ایک آدھ چیز ہے بھی تو وہ بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔ دوسرے اس کی زبان اس وقت کی ہے جب کہ اُردو نے میدانِ ادب میں پہلا قدم رکھا ہے۔ اس لئے نہ صرف زبان کی صورت و شکل میں ہی فرق ہے بلکہ طرزِ ادا میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔

دکن میں ہندی نے جب ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں اس وقت کے ادیب اور شاعروں نے دو دریاؤں کو جو مختلف سمت میں بہہ رہے تھے ایک نہر کھود کر لا ملایا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے اور ایرانی عشق کے پہلو بہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ دکھائی دیتا ہے صورت ایک ہے مگر جلوے دو ہیں۔ بات ایک ہے مگر مزے دو ہیں۔ بعد میں جو ادیب اور شاعر آئے۔ جو مئے شیراز کے متوالے تھے انھیں جو چیزیں اجنبی اور غیر مانوس اور اپنے ذوق کے خلاف نظر آئیں، وہ انھوں نے چن چن کر پھینک دیں اور بجائے ہندی کے فارسی عنصر غالب آگیا۔ اس میں وَلی اور اس کے ہم عصر بھی ایک حد تک قابلِ الزام ہیں۔ اس زمانہ مولوی حالی ایک ایسے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے اُردو میں ہندی کی چاشنی دے کر کلام میں شیرینی پیدا کردی مگر ہم عصر شعراء میں اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ قدامتِ زبان اور طرزِ ادا نے اسکی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور جب تک اس زبان سے پوری واقفیت نہ ہو، اس کا لطف حاصل نہیں ہوسکتا۔ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے اس وقت دودھ کی بو نہیں گئی تھی۔ ان خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال کے منجھنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجے کے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ میں یہاں چند شعر نقل کرتا ہوں جن میں زبان کی دقت کم ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

عشق کا رتبہ کس قدر بڑھا دیا ہے اور اس بلند مضمون کو کس سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ شعر اُردو کے اچھے اور منتخب اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا

اور

جا سکتا ہے۔

چند اشعار اور لکھے جاتے ہیں۔

بنتی کہو پیا کوں ہم سیج کی نہ آوے   اس باج منج گمے نا منج باج کیوں گماوے

(بنتی۔ منت سماجت — گمنا۔ وقت کاٹنا، بسر کرنا — کی۔ کیوں)

مطلب یہ ہے کہ پیا سے منت سماجت سے کہو کہ میری سیج پر کیوں نہیں آتا۔ مجھ سے تو ایک دم بغیر اس کے بسر نہیں ہوتی وہ میرے بغیر کیوں کر بسر کرتا ہے۔

زہد ریا تھے بہوتن بدنام ہو رہیا ہوں   پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی

(تھے۔ سے — بہو۔ بہت — پرم۔ پریم، محبت)

تج بن رہیا نہ جاوے ان نیر کچ نہ بھاوے   برہا کتا ستاوے من سیتی من ملا دو

(ان۔ غذا — نیر۔ پانی — برہا۔ فراق — کتا۔ کتنا)

رقیب کا ہے کو کرتا ہے ہم سوں کچ بحثاں   قبول ظلم و جفا ہے جو آئے جاناں تھے

(تھے بمعنی سے)

جیکوئی عشق میں ثابت سدا ہے جیو اس کا   سو اس کے نانوں سے میخانہ سب معمور کر ساقی

(نانوں۔ نام — جیکوئی۔ جو کوئی)

رقیباں منے جا بلانے منجے   کہو اس بلانے کو کیا نانوں ہے
رہے پانوں دل سوں چلوں تیرے پنتھ   کہ اس پنتھ چلنے کو دل پانوں ہے

(پنتھ۔ رستہ، طریقہ — منے۔ تئیں۔ پاس)

بجز چی قدر پیو کا وصل کی دلیس   سنو اس برہ کی راتاں میں پائی

(دلیس۔ دن — برہ۔ ہجر)

تمہارا سیاں ہونا منج چوک اوپر   کہ میں بالی ہون ہور نادان بچاری
اونیندی ہے مج نین تج یاد سیتی   کہو تم نین میں ہے کاں کی خماری

(اونیندی۔ بے نیند کے — میا۔ محبت — کاں۔ کہاں)

یعنی میری آنکھوں سے تو تیری یاد کی وجہ سے نیند اڑ گئی مگر تیری آنکھوں میں

جو خمار بھرا ہوا ہے یہ کہاں کا ہے)

ان اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں۔ قلی قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ قدیم زبان سے واقف ہیں انھیں اس کا خاص لطف آئے گا۔ میں نے حتی الامکان ایسے اشعار دیئے ہیں جو زبان کے لحاظ سے بھی صاف ہیں۔ ایسی غزل کے چند اشعار لکھتا ہوں۔ زبان اور مضمون کی سادگی اور اس کے ساتھ شوق، درد اور گھلاوٹ ملاحظہ ہو۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا — پیا باج یکتل[1] جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے — کدھیں[2] اس سے مل بیسیا[3] جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

اگر دو ایک شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا جائے جن کا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے تو ہمارے ہاں کی عشقیہ شاعری میں کوئی بات نہیں نظر آتی۔ چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر اور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں، وہی مضمون ہیں اور وہی طرز ادا اور وہی بحریں ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان قلی قطب شاہ کا کلام اردو کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں ہے۔ عشق و مستی اور تصوف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔ چند شعر بطور مثال کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

یوں آج دستا[4] ہے سکی[5] اس وقت مصلحت[6] منجے
جا بیٹھوں گا میخانے میں اس ٹھار[7] ہے عشرت منجے

---

[1] یکتل - ایک دم، ایک لحظہ [2] کدھیں۔ کبھی [3] بیسنا بیٹھنا [4] دکھائی دیتا ہے [5] سکھی [6] مصلحت [7] جگہ، مقام

پیالا پرم کا ہاتھ لیوں دوجاں[1] کے سنگ تھے دور ہوں
ہے خوب جیکچ[2] جگ منے سو ہے سدا دولت منجے

پلا سا قیا منجکو مستانہ مے — کیا ہے بہوت گرم جنگ ہونے
جکچ[3] عشق کوچے میں ہے سلطنت — نہیں دیکھیا ہے کدھیں اس کو کے
سدا بھو لبن اور مد[4] ہے منجے — نہیں ہے خماری کبھیں، ہو دے
سپنو رن[5] ہے تج جوت سوں سب جگت — نہیں خالی ہے نور تھے کوئی شے

زہد ریا تھے بہوں بدنام ہو رہیا ہوں — پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی
مستی تھے آپ صراحی کرتی تھی سرکشی نت — کرتی ہے جام کو اب ہر دم سلام ساقی

اب مست اچھے[6] دائم ہمیں مست اچھنیکا ہنگام ہے
ساقی صراحی نقل ہور پیالے سو ہمنا کام ہے
عاشق اول تھے ہیں، ہمیں سرمست ازل تھے ہیں ہمیں
نا آج کل تھے ہیں ہمیں زاہد کو نیں یہ فام[7] ہے
روز عید[8] کے عید آنے میں ٹک شیر خرماں کھانے میں
صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے
منگتا ہے مد مستاں کنے مد باج نین سکتا رہنے
میخانے کے کوچے منے تو[9] متقی بدنام ہے
ساقی پیالا منج پلا پیالا پینے ہوتا[10] دلا
اس بھیو کو تو لیا کر ملا جس بھیو تھے مج آرام ہے

---

[1] غیروں [2] جو کچھ [3] جو کچھ [4] شراب [5] ماہ کامل [6] اچھا ہونا یا رہنا [7] فہم
[8] روز عید [9] میں [10] چاہتا ہے۔

قطبا نبی کے ادھار[1] تھے رحمت ہے نت کرتا رہے
تو تج علی کے پیار تھے کے تلتل[2] نوا انعام ہے

گرجا ہے میگھ سحر[3] تھے تازہ ہوا ہے بستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا تو نے جا جواں قدراں کنے[4]
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
ادنو نہال پھولاں ہے جام خو[5] سو بادہ
نرگس اپن پلک سوں جھاڑو کیے شبستاں
مکھ نور پر دسے یوں مج خط عنبریں او
جوں سو اُپر ہے بادل ریحان سوں گلستاں
بیہوش میرے دل کوں مٹھے اُدھر[6] جلائے
گلذار ہے عجب او دو لعل شکرستاں
مج عشق کے گدا کوں ادر رنگ شاہی دیتا
سب عاشقاں منج انگھے[7] ہیں طفل جوں دبستاں
روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالا
بھرے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

ایک رباعی ہے

مستی کے ملک میں ہے جہانبانی منجے
خوباں کے دکھین میں ہے مسلمانی منجے
خمار کا خم خانہ اہے مٹھا لوں میرا
ہر مد کا سو بند[8] نگیں سلیمانی منجے

ایک دوسری رباعی ہے

کب لگ[9] اچھے لب پہ زہد دل میں جام
اس پاپ بھریا سوز ہے منج کیا کام
مد[10] کے مدے لیا و جو صفاتیں ہیں تمام
یک پختہ برابر نہیں ہے سو لک خام

---

۱ مدد، حمایت ۲ ہر دم ہر آن ۳ پھر سے از سر نو ۴ پاس ۵ اپنی ۶ لب ۷ آگے ۸ بوند ۹ تک ۱۰ مطلب یہ ہے کہ شراب کے مقابلہ میں جتنی عمدہ صفات ہیں لاؤ تو دیکھو گے کہ جس طرح ایک پختہ خیال کے مقابلہ میں سو لاکھ خام خیال کچھ حقیقت نہیں رکھتے اسی طرح ایک شراب کے سامنے لاکھوں صفات ہیچ ہیں۔

غرض اس قسم کے سینکڑوں شعر ہیں جن میں مستی اور مے نوشی صاف بہتی نظر آتی ہے۔ یہ سب فارسی شاعری کا طفیل ہے جس کا چربہ شاعر نے اپنی زبان میں اُتارا ہے۔ یہ رنگ بہت خوب ہے مگر فارسی میں ضرورت سے زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔

ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے شاعر کے زورِ کلام اور قوت بیان کا بہت اچھا اندازہ ہوسکتا ہے۔

رکھ ایک ہے ہر ٹیک کدھن[1] لاکھ چمن ہے ۔۔۔ لکھ جوت ہے ہر ٹھار ولے ٹیک رتن ہے
سمدور[2] ہے یک ہور ندیاں ہیں سو ہزارا ۔۔۔ پاتاں سو کروڑاں ہیں ولے ٹیک رسن[3] ہے
کس ٹھار ہیں دستا[4] نہیں سب ٹھار ہے بھرپور ۔۔۔ دیکھین کو سکت کاں[5] اسے ہر ٹیک نین ہے
منج عشق گری آگ کا یک جنگی[6] ہے سورج ۔۔۔ اس آگ کے شعلے کا دھواں سات گگن[7] ہے
اس کے سو پرہنت[8] میں چل سیس[9] سوں قطبا ۔۔۔ تجکوں سمدگا رحسین اور حسن ہے

کیا اشعار اپنے خیال اور قدرتِ بیان میں حال کے کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں۔؟

علاوہ ان خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جو ہمارے شعرا میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اُردو شعراء میں سوائے سودا اور نظیر کے کسی دوسرے کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت، حمد و نعت، منقبت مرثیے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے مثلاً متعدد مثنویاں پھلوں اور میووں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا گیا ہے یہاں تک کہ بڑکی بڑولی، بتولی، انباڑا[9]، سنجل[10] گنگل[11]، سیندولے[12]

---

۱ کدھن۔ طرف، سمت ۲ سمدور بمعنی سمندر ۳ رسن۔ زبان ۴ دستا۔ دکھائی دیتا ۵ کان بمعنی کہاں ۶ جنگی بمعنی چنگاری ۷ آسمان ۸ پرہنت، پہنت بمعنی راہ محبت ۹ سیس بمعنی سر ۱۰ ایک قسم کا کن ۱۱ تاڑ کا پھل ۱۲ ایک چھوٹے سے پیڑ کی جڑ ہے جسے حیدرآباد میں میخ میوہ کہتے ہیں ۱۳ سیندھی کے درخت کا پھل۔

کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک مثنوی سبز ترکاری کے بیان میں ہے جس میں دھنئے، ادرک، لہسن تک کا ذکر ہے۔ اسی طرح ایک مثنوی شکاری پرندوں کے بیان میں ہے۔ علاوہ ان کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اپنے محلات (الٰہی محل، باغ محمد شاہی، داد محل، اعلیٰ محل، حناں محل) اس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کے رسوم، اپنی سالگرہ، شب برات، میلاد نبی، عید غدیر، سوگ، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ ایک مکالمہ صراحی و پیالہ پر اور دوسرا کالی گوری پر لکھا ہے۔ یہ بھی دونوں مثنویاں ہیں۔ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ گو اس نے فارسی شاعری کا پورا اتباع کیا ہے مگر اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچہ سے باہر نکل کر صنعت و قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ بحیثیت شاعر کے خاص امتیاز اور وقعت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ لکھا بلکہ اس نے حلقۂ تقلید سے باہر نکل کر جس میں اردو شاعری ابتدا ہی سے مقید ہو گئی تھی، کس قدر آزادروی اور جدت کا مسلک اختیار کیا اور اپنے مشاہدہ کو کام میں لاکر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جس سے اردو کے بعد کے شعرا بھی قاصر رہے۔

حمد و نعت، منقبت، مناجات نیز دیگر مضامین پر بہت سی مثنویاں لکھی ہیں ان کے نمونے دینے سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ قصائد بھی بہت لکھے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

باغ محمد شاہی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں سے یہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

محمد ناؤں سے بستا محمد کا اے سب سارا ـ سو طوباں سوں سہلتا ہے جنت نمنے چمن سارا

ؔ سرمہ کا وہ خط جو عورتیں آنکھ سے کے کر زلف تک کھینچتی ہیں ؎ اے معنی یہ

دِسے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیوے — سو تیوں دستا دِلاں میں میویاں کاں برن[1] سارا
بہے دم عیسوی دائم چمن میں گل لگانے تیں — ہرے نہالاں کے جلوے تیں ہشاطا ہو ہوں سارا
سٹر کے سے باغ کوں نکہت کھلے منج باغ کے غنچے — سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ جگملن[2] سارا
چمن کے پھول کھلے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا — سہاتا[3] تھا محمد پھل نمن[4] ان نین سارا
دِسے ناسک[5] کلی چنپا بہواں دو پات ہیں لسکے — بہنور تل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشے داکھ[6] لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں — نہے اس داکھ منڈوا سو جیسا سبز گہن سارا
اناراں میں سہے دانے سو جوں یاقوت تبلیاں میں — ہر ایک پھل اس اناراں پر سہے سکے نمن سارا
کھجوراں کے دسیں چھونکے[7] کہ جوں مرجان کے پنجے — سپاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہور رین سارا
دسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں — ہوا اس کے تاج کوں کہتا ہے پیالا کر دھن سارا
دسیں جاموں کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم — نظر لاگے یتوں میویاں کوں رکھیا ہے جتن سارا
صفت کرنے کوں سوسن بی کھلیا ہے دس زباں اپنے — دھن سب سندریاں کی تیں کھلیا نرگس تیں سارا
چمن آواز سن بلبل اپس میں آپ الاپیں ہیں — سو تیں آواز سوں موراں کریں قصاں این سارا
دکھت رکھ مست ہو دستک بجا دیں پات ہاتاں سوں — سو ڈالیاں ڈلتے ہو متوال ہیں پھولاں برہن سارا
مگر شبنم کا مے ہے یا ادھر جلاب کا پیالا — لو بی خوب ہور ادبی خوب تجھ سوں مل یوں سارا
امنگا آپ امنگاں سوں اپس میں آپ مل ناچیں — تننّا کا تنن ناچیں ہو تنے تن تن تنن سارا

قصیدہ منقبت کی تشبیب کے چند شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

آج شہ جیں چلیا شرق نگر تھے شتاب — ڈھال فلک کی اچا[9] او شہ عالی جناب
باندھ خنجر کرن زریں فرنگ ہاتھ لے — صبح کے وقت آتیا پیک[10] دو پیالی شراب
چرک[11] فلک فیل مست مستی سوں مکھ لال کر — گرہو چلنے لگیا دن لے کٹک[12] بی حساب

---

[1] برن۔ جسم [2] مکمکانا۔ جگمگانا [3] سہاتا۔ زیب دیتا تھا [4] نمن۔ مانند [5] ناسک۔ ناک [6] داکھ۔ انگور [7] چھونکے۔ گچھے [8] لعاب لب [9] اچا۔ بلند کیا (اچانا فعل سے) [10] پیک۔ پی کے [11] چرک۔ چڑھکے (عربی خط کی وجہ سے مسخ ہو گیا ہے) [12] کٹک۔ فوج۔

ذرّے ہو فراش سب چلیئے شہ جیں آگے — دیتے سراچے شفق لااسے زریں طناب

قوسِ قزح ہات لے جوڑکہ[1] تیر استوا — سو کشش جو کیا نس[2] کہ اڑلنے غراب

سو ہے غلط یوں نہیں ہے قضیا یو توں سُن — فتح و ظفر چند کا چرخ دیا اس جواب

شاہ ختن سُن چلیا غرب نگر تھے لے فوج — تنکے تنا رین رنگ جیسے اہے مشکناب

کش کہ چالیا ہات قوس اسے اسماں کی — سو را تارن کوں تیں جوڑیا ستارے شہاب

جب آپس میں ان (چاند سورج کی) جھڑپ ہو گئی تو

اتنے میں دیتا اہے صلح خدا تن منیں — ہے تمیں رینی دن کی شہ نالڑ تم لتنے باب

میں کیا تم دو کوں شاہ یک سرج ہو ٹیک ماہ — دھرتی تمیں دو نو جاؤ دونو کوں سر یہ ہے داب

دن کو سُرج رینی کو چند بھی کیا ہے دہاب — چاند کو کتیا مجی سو کوں کتیا ذہاب

"چرخیات" (فلکیات پر متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ایک اور قصیدہ منقبت میں لکھا ہے اس کی تشبیب بھی اسی قسم کی ہے اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی تشبیہات میں سورج، چاند اور ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شام کو سمندر قرار دیا ہے جس میں سونے کی کشتی ڈوبتی ہے اور اس کے ڈوبنے سے لاکھوں کروڑوں بلبلے نمودار ہوتے ہیں اور یہی ستارے ہیں جو آسمان پر چمکتے ہیں۔ شعر یہ ہے۔

رنی کے سمند سیام میں سنے کی روزق ڈبیا — ڈبنے میں ترلنے لگے بڑ بڑے کے لکھ ہزار

دوسری جگہ سورج کو یوسف فلک سے تشبیہہ دی ہے کہ مغرب کے کنویں میں اسکے ڈوبتے ہی زمانہ میں یعقوب کی آنکھوں کی طرح اندھیرا چھا گیا۔

غرب کے چہ میں پڑ یوسف انبر کا ہور — جگ سہیں یعقوب کے نین نمن اندکار

دوسرے شعر میں کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ بجھ کر گلشن ہو گئی اور یہ اندھیرا جو دنیا میں نظر آتا ہے وہ اسی آگ کا دھواں ہے

آگ ابراہیم کا بجک ہوا پھول بن — رین سو تس آگ کا ہے دھنویکا دھندکار

۱۔ جوڑکہ۔ جوڑکر ۲۔ نِسی۔ رات۔

دوسری جگہ کہتا ہے کہ چاند سکندر کی طرح رات کی ظلمات میں چلا جا رہا ہے اور تارے اسے رستہ دکھانے کے لئے شمع کا کام دے رہے ہیں۔

چند ہو سکندر چلیا ریج ظلمات میں شمع دیپک مشعلاں روشن ہوئے اپار

ایک جگہ لکھتا ہے کہ سورج نے چرخ کے خم خانے میں گھس کر اس قدر شراب پی لی کہ بدمست ہو کر مغرب کے چشمہ میں جا پڑا۔

چرخ کے خم خانے میں سور پیا جانو مد مست ہو جا کر پڑیا غرب کے چشمے منجھار

ایک دوسرے شعر میں آسمان کو لگن سے چاند کو شمع سے اور تاروں کو پتنگوں سے تشبیہہ دے کر کہتا ہے کہ تارے سوز عشق سے بے تاب ہو کر چاند کی شمع پر قربان ہو رہے ہیں۔

گگن ہے لگن، شمع چاند، تارے پتنگ کے نمن اڑتے ہیں اس آس پاس عشق تھے بے اختیار

آگے چل کر آسمان کو حوض بتایا ہے جس میں رات پانی کی طرح بھری ہے۔ چاند اس کا فوارہ ہے اور تارے بوندیں ہیں۔

گگن کے سو حوض خانے میں ین بھریا نیر جوں چاند بھو یارا نمن تارے ہنداں نیر سار

غرض اسی طرح کی بیسیوں تشبیہیں دی ہیں اور جب سب تشبیہیں ختم ہو گئیں اور کوئی نہ ملی تو آسمان کو مدرسہ بنایا، چاند اس میں مدرس بنے اور تارے طالب علم ہوئے جو مدرس سے بحث کر رہے تھے۔

گگن کے مدرسے منے چاند مدرس کنے بحث کرن تارے آئے طالب علماں کے سار

ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علاوہ غزلوں کے مختلف مضامین عشقیہ اور غیر عشقیہ پر مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں اسی طرح وہ شاعر ہے جس نے واقعہ کربلا کے متعلق پر درد مرثیے اور نوحے تحریر کئے۔ نمونہ کے طور پر ایک نوحہ لکھا جاتا ہے۔

دو جگ ماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن رؤں کی لکڑیاں جا لگر کرتی ہیں خواری وائے وائے

؎۱ رداں ؎۲ جل کر۔

ساتو[1] گگن آٹھو[2] جنت ساتو دریا ساتو دھرت
ایکس تھے ایک آپس میں آپ دکھ کرتے کاری وائے وائے
کالا کیا کسوت سبکا دیکھو اما ما دوکھ[3] سے تھے
ظلمات بی[4] کالا ہوا اس دکھ سے تھے بھاری وائے وائے
لوح ہور قلم کرسی عرش قدسیاں ملک غلماں سب
بجلیاں بدل[5] اڑوائتے[6] ہیں رات ساری وائے وائے
اسماد ہا جھج جبالا ہوا ، سورج اگن والا ہوا
چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اُپاری وائے وائے
پنکھی سٹے ہیں سب پراں رو رو بھرائے سمدراں
چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو توزاری وائے وائے
کالے ہوئے دکھ تھے منگل سر پہ سٹیں ماٹی سگل
تو پکڑے اس دکھ تھے جنگل ہے بیقراری وائے وائے
پھولاں سُکے[7] سب دکھ ستی مکھ موڑے بلبل جھکھ ستی
کوئل حسینا دکھ ستی بن بن پکاری وائے وائے
دیکھو تمیں اے مانساں[8] ڈالے چریاں نا پنکھیاں
دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھر بھاری وائے وائے
دو جگ خراباں ہو رہے حیواں کباباں ہو رہے
سمدر سراباں ہو رہے نا ہوئے جاری وائے وائے
دکھ آگ سوں جگ بن جلے آکاس تا دھرتی سے لے
کہن پر فرشتے کھلبلی سٹ اختیاری وائے وائے

۱۔ ساتوں ۲۔ آٹھوں ۳۔ دکھ ۴۔ بھی ۵۔ بدلے، عوض ۶۔ چلاتے ہیں۔
۷۔ سوکھے ۸۔ لوگو۔

حضرت نبی کے گیسواں دو اماماں کے پکاں[1]
جبریل جھلاوے اپ ہتاں[2] آرات ساری وائے وائے
حضرت علی کے دو بٹیاں[3] کاندھے نبی کر اُٹنیاں
تس پر چڑھے دو شہ جواں اس دھات ساری وائے وائے
شہزادے کے سب کے اونٹاں ہمنے[4] پکارے اس ماں
عفعف نبی تنکوں سناں کے دوی باری وائے وائے
جبریل آکر کہے تمری[5] براں جو عف گئے
اس عفو تھے جگ پائے سب رستگاری وائے وائے
دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھے
لہو میں لڑے پیاسے بھکے دیکھو یہ خواری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کئے کیسے ہتھر یو زخم کاری وائے وائے
دکھ بات کو جیب جب لکھنے قلم بی نا چلے
دل جیوں شمع[6] جل تلملے سد کی ہماری وائے وائے
قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مدد منج پنج تن
راکھے خدا منج کو متن دشمن کو خواری وائے وائے
قطبا کو ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد
تو منج مدد حیدر ولد بیریاں کو زاری وائے وائے

اوپر جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے پیش کئے گئے ہیں ان سے فارسی شاعری کا اثر صاف ظاہر ہے۔ خیالات وہی ہیں، استعارات اور تشبیہات پر بھی وہی رنگ غالب ہے اور بحریں بھی فارسی ہیں، لیکن باوجود ان تمام اثرات کے

---

[1] پنگیں [2] ہاتھوں [3] بیٹے [4] مانند [5] تیسری بار [6] شمع

ایک بات خالص ہندی ہے جو اس کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے یعنی بخلاف فارسی شاعری کے عورت کی طرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مرد کو بے وفائی کے طعنے دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف سے بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے۔ برہ کی راتیں بے قراری میں کاٹتی ہے۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق یہ ہندی کا رنگ ہے جو شاعر نے اپنی اردو شاعری میں قائم رکھا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے جہانگیر کے دربار کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ "ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمتہ کی ایک غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اس کو سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا ؎

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

" بادشاہ دفعتہً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً اٹھوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملا نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا "حضور، خیر باشد" بادشاہ نے کہا امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملّا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشوونما پایا تھا اس لئے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی انھوں نے اسی طریقہ پر کہا ہے گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کس غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔"

اس قسم کے ہزاروں شعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً

پیا کس سے گمائی رات ساری — تمن انکھیاں میں پائی ہیں خماری

یہ بالکل امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

گماکر رین دوتی[1] سے چھپاتے — میں بوجی ہوں نشانیاں سب پین کے

کہو رات کن سات کیتی ہیں باتاں — کہ جو تاہے تم میں بھے رنگ خماری

غرض اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے اور اس سے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے اور بجائے ہمدم و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب کے دوتی[2]، ڈتن اور پریم، نیہ، پرت اور برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں۔

تری نیہ کا منجکو بچھو لڑیا — میرے سبھی تن میں بس اس کا چڑیا

میں آئی تج پاس اتارا کرن — تہیں کرن بارا اتارا پیا

جو دیکھی میں اس روپ نتا سجن — نین اس سلونے بھے پھر لس چڑیا

نوازیں آپ میاسیتہیں تں مجکوں — کہ میں باندی ہوں تج لوحب سارا

نکو ہو نکو ہو سہیلی کھیلی — تجے شہ کریں گے میا سوں نہالا

تہیں میرے مندر سو آج آنو لالا — تم او پر بھے واروں گی جوبن سو بالا

اگر سلطان محمد قلی قطب شاہ جہانگیر کے زمانے میں ہوتے اور وہ ان کا کلام سن پاتا تو کچھ تعجب نہ تھا کہ طیش میں آکر اس کے ملک پر چڑھائی کر بیٹھتا۔

بعد کے اُردو شعراء پر فارسی شاعری کا رنگ ایسا غالب آیا کہ یہ خصوصیت اُردو

---

[1] یعنی بسر کرنا [2] یعنی رقیب یا غیر عورت۔

شاعری سے بالکل اُٹھ گئی اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندی الفاظ بھی زبان سے خارج ہو گئے اور استادی الفاظ کے متروک کرنے میں رہ گئی۔

علاوہ ہندی شاعری کی اس خصوصیت کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندی زبان کی بعض اور خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں اور الفاظ تو بکثرت ہیں یہاں تک کہ وہ حمد و نعت و منقبت میں بھی ہندی کے مذہبی الفاظ استعمال کرتا ہے مثلاً

کروں ابتا حمد کرتار کا — کہ نعم ہے کرتار سنسار کا

کہوں حمد اس حی سبحان کا — دیاونت داتار دیان کا

وہی رب نرنجن ہے لاریب فیہ

کہ تو ہیں اہو سب جگت کا گسائیں

دنیا بسے لگ سدا انند سوں نبی علی کے سو صدقے جگ میں

اہے قطب شہ کہ داس ہے وہ علی ولی شاہ مرتضےٰ کا

ہندی زبان میں ترکیب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ دو اسم مل کر ایک لفظ بن جاتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً بعض وقت دونوں اسموں کے درمیانی حروف علت حذف ہو جاتے ہیں۔ جیسے پنگھٹ، پت جھڑ، کبھی پہلے اسم کا آخری یا دوسرے اسم کا پہلا حرف صحیح ساقط ہو جاتا ہے جیسے لوچن۔ پھلیل (پھول تیل سے) بعض اوقات دونوں اسم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں اور کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی اور یہ ترکیب بغیر کسی حرف ربط یا اضافت کے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے پتلی گھر، کرن پھول ان داتا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں آخری قسم کی ترکیب بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے صرف ہندی الفاظ ہی کی پابندی نہیں کی بلکہ عربی فارسی کا استعمال بھی اسی قاعدہ کے مطابق کیا ہے۔ مثلاً

قطبا کو ہے اللہ مدد، بستا ہے اس دل میں احد

یا

جنت حور ہے یا پری استری

لیکن کمال یہ ہے کہ ہندی کے ساتھ فارسی عربی الفاظ بلا تکلف ملا دیے ہیں۔ مثلاً

۱۔ جگت لوح تھے کفر اندکار کوں

۲۔ فارس اگن ہو ٹھنڈی کفر نگونسار ہوا۔

۳۔ کفر ریت کیا ہور اسلام ریت۔

اسی طرح سموم باد اور وصال باد بھی استعمال کیے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ آزادی یہ برتی ہے کہ فارسی قاعدے کے مطابق ہندی فارسی الفاظ سے ملا کر فاعلی ترکیب قائم کر دی ہے۔ مثلاً

نبی مولود آکتیا ہے دو جگ تائیں نورانی

فلک پر سب ملک کرتے ہیں تاریاں سوں پھل افشانی

پنکھاتیں سو سُدجوں پوں آبیز تھے　　پراں تھے جو جبریل کے تیز تھے

ایک جگہ ہندی ترکیب کی رو سے روزِ عید کو روزید لکھا ہے جس طرح آج کل بقرعید کو بقرید یا بکرید بولتے اور بعض اوقات لکھ بھی دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کمال کیا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کا استعمال کیا گیا۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

پیا آئے ہیں روپ کے رنگ سوں　　کہ چوتا ہے اس مکھ تھے نیر زلال

(نیر کے معنی پانی)

اس کے علاوہ فارسی واؤ عطف کا ہندی الفاظ اور جملوں میں بلا تکلف استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

باغ وپھل وجل سبھے تو اَما　　بن صحبت یار خوش ندیسے

تو اپے بوجے میرے سب بن وباپ

تجھے حسن جھلکارہے سور جیسا   زبردست توں ہے وسب تیر ازیرا

تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب، فارسی ہیں۔ البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہے اور مشاہدہ سے کام لیا ہے اور یہ تشبیہیں خالص ہندی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ران کی صفائی کو کیلے کے تنے سے تشبیہ دی ہے۔

کیلے گابھے تھے نازک ہور صاف ران   نہیں اسکی صافی میں کوئی صاف جان

یا کنول کے پتہ پر ڈھلتی ہوئی بوند کی تشبیہ ہے

کنول کے پان پر ڈھلتی جل بھند   کہ یا جھلتی بھو نرنیناں پوں کے

ایک جگہ ہندی مذہبی روایت سے تلمیح کی ہے۔

نبی صدقے قطب سوں آملی ہے   ستا جوں رام سوں منج او نگاری

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے عربی الفاظ کو اپنے کلام میں اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح اس کے زمانے میں لوگ عام طور پہ بولتے تھے یعنی لکھنے میں صوت کی نقل کی ہے۔ تحریر دراصل تقریر کی نقل ہے اور اصل عربی املا کی پرواہ نہیں کی اور اسی کو صحیح سمجھا ہے جو بولنے میں عام طور پر مروج تھا۔ سید انشاء اللہ خاں نے دو صدی بعد اس نکتہ پر نظر ڈالی جس سے ان کے ذوقِ زبان اور دقیق نظری کا پتہ لگتا ہے۔ وہ اپنی مشہور اور بے مثل کتاب "دریائے لطافت" میں لکھتے ہیں کہ "ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا ہے عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو اس اصول کے قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں مثلاً سید انشاء کی رائے میں برقا صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے یا وہ غدر کو بفتح "د" اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکون "د"[1] ہے۔ اس قسم کے

---

[1] ملاحظہ ہو دریائے لطافت (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو) صفحہ ۲۴۱ و ۲۴۲ و مقدمہ کتاب صفحہ ۴ و ۵

الفاظ کی بہت مثالیں دی ہیں۔ اگرچہ یہ نکتہ اصولِ لسان کے لحاظ سے بہت خوب بیان کیا ہے لیکن اپنے کلام میں کہیں اس پر عمل نہیں کیا سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس نکتہ کو دو صدی قبل سیّد انشاء سے بہتر سمجھا اور اپنے کلام میں جا بجا استعمال کرکے دکھایا ہے مثلاً

قفل کو کلف لکھا ہے — تشبیہ کو تشبی لکھا ہے
صراحی ،، صرائی ،، — شمع ،، شما (شمے) ،،
منع ،، منا ،، — وضع ،، وضا ،،
ساعت ،، سائت ،، — نفع ،، نفا ،،
فہم ،، فام ،، — انعام ،، انام ،،
مصلحت ،، مصلت ،، — دعوے ،، داوے ،،

وداع کو ودا لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی طرح عَرَش، فَرَش، ظُلَم، وَخَت (وقت) عِشَق، شَرَق، غَرَب بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ اصل الفاظ کے اعراب کی پروا نہیں کی ہے۔

الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی بہت کم لحاظ کیا ہے۔ مثلاً

جبیت، بنیاد، جوت، یاد، شبرات، بھوک، پیاس، صورت، مصلت (مصلحت) صحبت، تعریف، روح، حمد، دعا، نظر، شکل کو مذکر باندھا ہے۔ ایک جگہ محبت کو بھی مذکر لکھ دیا ہے۔

بعض جگہ جہاں فاعل مونث جمع ہے تو وہاں فعل کے پہلے جز کو بھی جمع ہی لکھا ہے۔ اُردو میں پہلے یہی استعمال تھا۔ اب بھی دلی اور نواح دلی میں بعض اوقات عورتیں اسی طرح بول جاتی ہیں۔ مثلاً

قطب شاہ کوں کھلاتیاں ہیں سہیلیاں رنگ بھرا میوا

سکیاں کی دھات ایسی ہے کہ جھند سوں — پیا سوں مل کہ ہوتیاں ہیں کنارے

کھلاتیاں، ہوتیاں ہیں۔ دیتیاں ہیں وغیرہ وغیرہ

قافیہ میں یائے مجہول و معروف کا لحاظ نہیں کیا۔ مثلاً تیرا اور ہیرا یا۔

دید اور بھید کا قافیہ باندھ دیا ہے۔

تمام بحریں (سوائے ایک آدھ کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ اُردو نے ابتدا سے، یعنی جب سے اسے ادبی حیثیت ملی ہے، غیر زبان کا عروض اختیار کیا۔ اگر بجائے فارسی (عربی) عروض کے ہندی عروض ہوتا تو اُردو ہندی نظم اور زبان میں وہ مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہے نہ رہتی یا بہت کچھ کم ہو جاتی۔ یہ مسئلہ تفصیلی بحث کا محتاج ہے اور یہ موقع اس کا نہیں ہے۔ غرض محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور خصوصاً زبان اُردو کی تحقیق کے لئے بے بہا ذخیرہ ہے۔

(رسالہ "اُردو" جنوری ۲۲ء)

مثل خالق باری

ایک قدیم ترین کتاب

خالق باری گزشتہ زمانے کی بے حد مقبول کتاب تھی اور مدتوں بچوں کے نصاب میں داخل رہی۔ جب تک مطبع کا وجود نہ تھا اس کے قلمی نسخے گھر گھر پائے جاتے تھے۔ مطبع کے جاری ہونے کے بعد بارہا کثرت سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ اب تک اسکی نسبت عام طور پر خیال تھا کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اس گمان کی بنیاد زیادہ تر کتاب کے آخری مصرع "گدا مجہ کاری خسرو شاہ" پر تھی۔ لیکن اب تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے مصنف ایک دوسرے خسرو ہیں جن کا لقب ضیاء الدین ہے اور عہد جہانگیری کے کوئی شخص ہیں۔ اصلی نام اس کتاب کا "حفظ اللسان" ہے اور سال تصنیف سنہ ۱۰۳۰ھ ہے (۱)

اس کتاب کی عام قبولیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس تتبع میں اسی قسم کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً اللہ باری، فرخ صبیان، صمد باری، رازق باری، قادر باری، حمد باری وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ مرزا غالب نے بھی قادر نامہ لکھا۔

---

(۱) دیکھو حفظ اللسان معروف بہ خالق باری مرتبہ حافظ محمود شیرانی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری کتابیں مبتدیوں اور طالب علموں کو فارسی سکھانے کے لئے لکھی جاتی تھیں، کیونکہ یہی اس زمانے کی تعلیمی اور تہذیبی زبان تھی۔ ان کا مقصد اردو زبان سکھانا نہ تھا۔ ایک زمانے میں یہی حال انگریزی زبان کا تھا۔ سنہ ۱۶۰۰ء تک انگریزی میں جتنی ڈکشنریاں لکھی گئیں ان سب کا مقصد طلبہ کو غیر زبانوں یعنی لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانی کے سیکھنے میں مدد دینا تھا۔ سولھویں صدی کے اختتام سے قبل کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ انگریزی زبان کی انگریزی میں کوئی ایسی لغت لکھی جائے جس سے اہلِ زبان یعنی انگلستان کے باشندوں کو خود اپنی زبان سمجھنے میں مدد ملے۔

خالق باری یا اس قسم کی جتنی کتابیں اس سے قبل لکھی گئی ہیں ان سب میں یہ کتاب سب سے قدیم ہے جس کا ذکر ان صفحات میں کیا جاتا ہے۔

مصنف اجی چند پسر دنی چند ساکن شہر سکندر آباد ہے سال تصنیف سنہ ۹۶۰ھ مطابق ۱۵۵۲ء ہے، یہ سلیم شاہ سوری کا زمانہ ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

درسن نہ صد و شصت حسابے	بتوفیق حق شد کتابے
.... لغت فارسی و ہندوی	سخن نظم نمودن جزوی
اجیچند بھٹناگر بندا	پسر دنی چند شعر کندا
کمر بجرم فرماندار	ساکن شہر سکندر آباد
متصل دارالملک مقام	حضرت دہلی نادر نام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کائستھ ہے۔ اسلامی عہد میں اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ اثر کائستھوں پر ہوا۔ وہ نشست برخاست، بات چیت لباس، طرز ماند و بود میں بالکل مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ فارسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ اُستاد سمجھے جانے لگے اور ان میں سے بعض کی کتابیں درس میں شامل رہیں اور اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں۔

کتاب کے اکیس صفحے ہیں اور کل شعر ۳۷۵۔ مصنف نے اپنے اور کتاب کے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے لیکن کتاب کا نام کہیں نہیں بتایا۔ اس کتاب میں ۲۹ عنوان ہیں اور شروع کے تین عنوان چھوڑ کر باقی سب اس وقت کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہر

عنوان کسی نہ کسی کارخانے یا شعبۂ معاشرت سے متعلق ہے۔ اس کی تقسیم کم وبیش ویسی ہے جیسی آئین اکبری میں شاہی کارخانوں کی ہے۔ یہ عنوان حسب ذیل ہیں۔

(۱) حمد (۲) آغاز کتاب (۳) مدح بادشاہ (۴) مطبخ خانہ (۵) آب دار خانہ (۶) طہارت خانہ (اصل کتاب میں طالخانہ لکھا ہے۔ غالباً طہارت خانہ ہوگا۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں طہارت کی اشیا کا ذکر ہے) (۷) خزانہ خانہ (۸) جامہ دار خانہ (۹) پائگاہ خانہ (۱۰) فیل خانہ (۱۱) شتر خانہ (۱۲) فراش خانہ (۱۳) سلح خانہ (۱۴) شمع خانہ (۱۵) طاش خانہ (۱۶) خیاط خانہ (۱۷) کتاب دار خانہ (۱۸) شراب خانہ (۱۹) شکار خانہ (۲۰) میوہ خانہ (۲۱) کشتی خانہ (۲۲) گردوں خانہ (۲۳) علم خانہ (۲۴) طبیب خانہ (۲۵) انبار خانہ (۲۶) مولیشی خانہ (۲۷) دار الضرب خانہ (۲۸) محبوس خانہ (۲۹) بیوہ خانہ

ہر عنوان کے تحت اس کے خاص خاص لفظ اور محاورے اور اُن کے ہندی مترادف بیان کئے ہیں۔

کتاب کے سر عنوان بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ اس کے بعد کتاب کا آغاز حمد سے یوں ہوتا ہے۔

باری تعالیٰ نام گوسائیں ... بسے بزرگی بہت بڑائی (۱)
خالق جن جگ پیدا کیا ... رازق سب کو بھوجن دیا
واحد یک پرستش پوجا ... لاشریک کوی اور نہ ددجا
بے چگوں جیہ (۲) روپ نریکھا (۳) ... بے نموں وہ جاتے نہ دیکھا
بے (۱) نیاز جو سنگہ (۴) نمانے ... بے قیاس کوع (۵) انت نہ جانے
مادر پدر نہ مائی باپ ... ہست خودی خود آپی آپ
الکھ (۶) نرنجن (۷) عالم غیب ... نرمل بداں پاک بے عیب

---

(۱) بڑائی (۲) جو (۳) کہیں نظر نہ آنے والا (۴) سنگ، ساتھ (۵) کوئی انتہا (۶) آنکھوں سے اوجھل، غیر مرئی، غیب (۷) جذبات سے پاک (یعنی خدا)

کتاب میں زیادہ تر اسما کا ذکر ہے اور انھیں کی تعلیم مقصود ہے۔ اسما کے ساتھ حسب ضرورت ضمنی طور پر افعال بھی آگئے ہیں۔ افعال میں مصدر، امر، مضارع، اور دو چار جگہ ماضی مطلق واحد غائب کے صیغے مذکور ہیں۔ فعل حال صرف ایک "ہے" آیا ہے پہلے مضارع ہی حال کا کام دیتا تھا۔ ان افعال کی صورت وہی ہے جو اس وقت مروج ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

ہونا، کٹنا، چھڑکانا، مرنا، دُھنا، مرنا، تاننا، پڑھنا، لینا، سونا، بٹنا، بیوہنگاؤ، بھراؤ، پاؤ، بجاؤ، سکھاؤ، گاڈ (گاڑ)۔ جہاد (جھاڑ)، جا، جان، پہچان، بکھان، چھان باندھ، تول۔ چلے، آوے، کہوں، کھوئے، مارے، ہے، روئے، ہوئے، پھرے، (پہنے) 'آوے'، بچھڑے، مانگے، سنوارے، کر سکے، کہے، چاکھے، کہیئے۔ دیکھا سیا، کیا۔

اب ایسے الفاظ یا اسما کی فہرست لکھی جاتی ہے جو اس کتاب میں استعمال ہوئے ہیں اور جواب بھی اُسی طرح بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ کسی کسی لفظ میں تھوڑا بہت فرق نظر آئے گا۔

رسوئی (مطبخ)۔ سالن۔ کھانا۔ (طعام خوردنی کہے کھانا)۔ اگھانا (گرسنہ بھوکا سیر اگھانا)۔ "ساتو" یعنی ستو (ترہ ساگ تلخان ساتو)۔ گیہون۔ دھان (گندم گیہوں سالی دھان)۔ ہانڈی۔ ڈوی (ھانڈی دیگ کفچہ ہے ڈوئی)۔ چلنی[1] یعنی چھلنی (چلنی ہے غربال بکھان۔ بیزیدن در ہندوی چھان) چھاج۔ کھر (؟) آٹا۔ توا۔ کڑاہی (کزغان کہوں کڑاہی جان) کٹورا۔ سلونا (نمک دار در ہندوی سلونا)۔ پھیکا (بداں بے نمک در ہندوی پھیکا) کٹورا۔ چولھا۔ کاٹھی (ہیزم) گوبر۔ اُپلا۔

داتوں۔ منہ پونچھن (نام داتوں کہے مسواک۔ منہ پونچھن کہے روپاک)

---

[1] خالق باری میں چالنی ہے۔

آرسی (آئینہ) کنگھی۔ مالا۔ پلنگ۔ کھاٹ (پلنگ، کھاٹ چہارپای جان)۔
دیا (شمع۔ چراغ ہندوی دیا۔ روشن کرد اُجلا کیا) ھار۔ پٹرا (چوکی)۔ چھاپ
(مہر) چھاپا (نشان) پنکھا (بادکش)

درزی (خیاط مخیط درزی جان)۔ سوی۔ تاگا (سوزن سوی
رشتہ تاگا)۔ ڈورا (جامہ بریدن۔ کپڑا کٹنا۔ تار تافتن ڈورا بٹنا)
پوند یعنی پیوند (بدان دوختن ہندوی سیا۔ تقطیع کردن پیوند ہے
کیل۔ پروتا (سفتن گرفت پوروں لاگا)۔ ٹوک (قطع) تانا بانا۔
سوت۔ کلاوہ (گلوبند)۔ تاگا یا ننگا۔ ٹوپا (نام کلاہ ہندوی
ٹوپا۔ ٹوپی (ٹوپی کلہ۔ پاگ دستار) پسکا (کمربند)

بستر سالا۔ (جامہ دارخانہ) اوٹ، گھرکوٹ۔ سرایے پردہ
گھرکوٹ۔ پردہ قنات ہندوی اوٹ) کپٹر کوٹی (تنبوہ) پچھوڑی (چادر
کہوں پچھوڑی سیتی)۔ تھیلی (خریطہ)۔ گالا (یختہ روی باغندہ گالا) پونی۔
گکڑی (سے متاع در ہندوی پونی۔ شدن کلاوہ گکڑی پونی) بچھانا
یعنی بچھونا (جامہ خواب در ہندوی بچھانا)۔ روی سبھا (مجلس بزم سبھا
پہچان) دھیان۔ گیان (بدان مراقبہ ہندوی دھیان۔ ہے سنو تک
دہ برمہ گیان)۔ درشن، سیوا۔ پوجا (سیوا طاعت ہم بندگی۔ پوجا نام پرستندگی۔ پوتھی
(پستک پوتھی نام کتاب) کتھا۔ تیاگ۔ بیراگ (زہد فقیری ہے بیراگ) جوگ (درویشی)
گرو۔ چیلا (پیر مرید گرو چیلا)۔ دھرم سالہ۔ یکیلا (ساکھ جماعت فرد یکیلا)۔ اکیلا (تنہا
بردجاہ اکیلا)۔ دیا۔ بدیا (علم) بدیاونت (عالم)۔ بھلائی۔

اناج۔ چاول۔ چھولا۔ (نخود) ہولا (نام نخود در ہندوی چھولا۔ بریاں ہوتا وملل (؟)
ہولا) السی۔

روکھ (درخت) پھلواری۔ جڑی بوٹی۔ ککری یا ککڑی یعنی گکڑی (ککری نام خیار
بخوانی)۔ کھرا (کھرا نام بدرنگ میدانی) یعنی کھیرا۔ ساگ۔ گھاس۔ گاجر۔ مولی۔ کانٹا۔

پھول ۔جڑ ۔ کلی ۔

ارد (ماش اورد ہندوی ناتوں مونگ ۔ موٹھ ۔ کنگی ۔ ارہر ۔ مٹر ۔ لوبیا ۔ رائی ۔ بنولا لونگ ۔ ہلد یعنی ہلدی (ہلد نام زردچوب بکھان) ہینگ (انگوزہ ہندوی ہینگ جان) ہڑ ۔ بھیڑا ۔ مرچ (فقل گرد) جاوتر ۔ ناگرموتھا ۔ سرسوں ۔ تیل ۔ سوپاری ۔ سہاگ ۔ پیپل ۔

ہڑتال ۔ پارا ۔ نیلا تھوتھا ۔ تریاک بمعنی تریاق (بداں زہر مہرہ تریاک) گوکھرو (حسک نام گوکھرو بکھان)

کھانڈ ۔ دودھ ۔ دہی ۔ لہسی ۔ مٹھائی ۔ پیوسی ۔ چھاچھ ۔ گھی ۔ کھٹائی ۔ چرچرا (تیز چرچرہ ترش کھٹائی) کڑوا ۔ پھیکا ۔ باس (بو) سلونا ۔

پھل ۔ انب ۔ کٹھل ۔ بڑھل ۔ کیلا ۔ کھجور ۔ داکھ (انگور)

ہتیاں (فیل خانہ) مہاوت ۔ گھڑسال (پائگاہ ہندوی گھڑسال) اونٹ سال (شترخانہ) اونٹ وال (ساربان) انکس ۔ اندو ۔ ناتھ (مہار) سونڈ دو مچی (دمچی) سانکل (زنجیر) اگاڑی ۔ پچھاڑی ۔ پاکھر ۔ جھول ۔ کھوٹی یعنی کھونٹی (در طناب میخ ہے کھوٹی) گاڈی یعنی گاڑی

سینہ (شیر) ریچھ ۔ چیتا (یوز پلنگ ہووے چیتا) گینڈا (گرگ) ہرن ۔ بھینس ۔ بھینسا (گاؤمیش را بھینس بکھان ۔ جاموش ہندوی بھینسا جان) بچھڑا (گوسالہ ۔ بکروٹا ۔ (بزغالہ کہیے بکروٹا) لوکڑی (۱) (روبہ نام لوکڑی جان) ۔ بکری ۔ چھیلی (گوسپند بز بکری چھیلی جان) سیسا (خرگوش) کوتا (کتا)

کولنگ ۔ کلنگ ۔ گید (گد) کونج ۔ تیترا (دراج) مور ۔ اولو (اُلّو) ۔ کوا ۔ کوکڑا (مرغ) ۔ چکور (سرخابہ) ۔ سوا (طوطا) کوئل ۔ کرکرا (سرطان نام کرک را راکھا) یعنی کیکڑا ۔ میں دلو حوت ہے کنبہ میں) یعنی مچھلی ۔

لڑائی (جنگ ، کارزار) ہتیار (سلاح) بان (تیر) جھنڈا (علم) اگن بان (آتش بازی) ۔ تروار ۔ جیت (فتح) ۔ کٹار (خنجر) ۔ چڑھا ایک (لشکر کٹک سوار چڑھا ایک) ۔ پانک

---

(۱) خالق باری میں لونکڑی ہے ۔

(بھیدا) دھنے (میمنہ) باہیں (میسرہ) گھاؤ مار ( ) ڈھول (طبل، دہل)

ٹکسال (دارالضرب) سونا۔ روپا (نقرہ)۔ تانبا۔ رانگ۔ پیتل۔ کانسہ (روئیں)۔ کسوٹی۔ کھان (معدن کان ہندوی کھان) بھاؤ۔ مول (قیمت بھاؤ نرخ مول) ماپا (پیمانہ)۔ تالا۔ کونجی۔ روک۔ تھوک (نقدی روک کلی تھوک) ہیرا۔ پنا موتی۔ رتن۔ رتی۔

اہرن۔ ہتوڑا (سنداں اہرن تپک ہتوڑا) کوئلا۔ لوہا۔ لوہ۔ انگار (آتش اخگر نام انگار)۔ باٹ (تولنے کا)

جوتشی (منجم۔ یعنی جوتشی)۔ پترہ (تقویم) گھڑی۔ پہر (ساعت گھڑی پہر ہے پاس) گھڑیال (ہے گھڑیال فارسی طاس) دن۔ رات۔ (یوم روز کہے دن جان۔ ہے شب رات رین پہچان)۔ ماس (شہر مہانہ ہندوی ماس) جاڑکالا (زمستاں کے لئے (جاڑکالا یعنی جاڑے کا موسم)۔ دھکالا (تابستان) پالا (بداں یخ ہندوی پالا)

بٹ مار۔ جواری۔ بندیواں (اسیر۔ قیدی) چور۔ سولی۔ پھانسی۔ بیڑی (جولاں بیڑی کندہ کاٹھ)۔ پاپ۔ ڈانڈ (جرمانہ)۔ بندن (بند)۔ سانکر یعنی سانکل یعنی زنجیر۔

پھلی پھولی (برومند ہے پھلی پھولی) انند (اچے چند انند ہے شادی) دبلا۔ موٹا (لاغر دبلا فربہ موٹا) اچوک (تیر بے خطا بان اچوک) گونگا۔ توتلا (بکم نام گونگا پہچان۔ الکن توتلا ہندوی جان) بھرپور۔

پنیالا (آبدار خانہ) بھنڈاری (خزانہ دار) رنڈسالا (بیوہ خانہ) بسانچا (سچا) مائی باپ۔ مہتا۔ منتری (وزیر) نیاؤ (انصاف) پسکھیا (تندرست)۔ دکھیا (بیمار، مریض) کھانسی۔ ناڑی (نبض) نرمل۔ رکھوالا۔ بڈائی (بزرگی) پرگٹ (ظاہر) چنتا (فکر) مہادکھ (درد عظیم)۔ بیاکل (بے قرار) چاؤ (شوق) سدا۔

جھرنا۔ ندی۔ ترنگ (موج) پوکھر۔ تال (تالاب) آندھی۔ جل تھل۔ بوندی (قطرہ) بوند (جرعہ) گہرا۔ تھاہ۔ پار۔ بوڈا (عرق آب جو پانی بوڈا)۔

رتلا (سرخ)۔ اوجالا (سفید ابیض اجالا۔ اسود سیہ ہندوی کالا) ہریا

(ہرا سبز)۔ ڈانگ (دامن کوہ ہندوی ڈانگ) باٹ (راہ)۔ ڈھیر

اوپر اب تک جو بیان کیے گئے ہیں وہ افعال و اسما یا بعض صفات کے الفاظ تھے۔ ضمائر میں صرف جو، جن، وہ، جیہ (یعنی جو) کوئی استعمال ہوئے ہیں حروف میں سوں (سے)، منہ (میں)، میں، کوں (کو)۔

کہیں کہیں، عربی اور فارسی دونوں کے لفظ لکھ کر ان کا ہندی مترادف دیا ہے مثلاً حوت ماہی مچھلی جان۔ خبز نان درہندوی روٹی۔ فرع شاخ ہے ڈالی بکھان۔ بزم مجلس سبھا پہچان۔

جیسا کہ ظاہر ہے اس کتاب میں چند کارخانوں کے بعض فارسی عربی الفاظ کے ہندی مترادف دیئے گئے ہیں۔ اس سے اس وقت کی زبان کی پوری کیفیت نہیں معلوم ہوتی۔ اگر کوئی ایسی کتاب ہوتی جس میں کسی قصے یا واقعات کا مسلسل بیان ہوتا تو اس سے اس عہد کی زبان کا صحیح اندازہ ہو جاتا۔ تاہم جو مترادف ہندی الفاظ آئے ہیں ان میں کثرت سے ایسے ہیں جو آجکل بھی اردو زبان میں اسی طرح بولے لکھے جاتے ہیں اور بعض چھوٹے چھوٹے جملے اور ٹکڑے تو ایسے ملتے ہیں کہ ان کی نسبت یہ شبہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آج کل بول رہا ہو مثلاً "کہہ نہ سکوں گفتم نہ تنوانم" میں "کہہ نہ سکوں" کی فعلی ترکیب وہی ہے جو آج کل مستعمل ہے۔ "خالق جن جگ پیدا کیا" "بے موں جو جائے نہ دیکھا" "ساکن شہر سکندر آباد" "مہنگا بیچے گراں فروش" "تنہا ماندن رہے اکیلا" "زاغ سیہ ہے کوا کالا" "کار گزار کرے جو کاجا" "زگارندہ جو گھڑے سنوارے" "قادر قوی جو سب کر سکے" "پردہ پوش جو پردہ ڈھانکے"۔

مترادف الفاظ چونکہ ہندی بیان کرنے مقصود تھے اس لئے صرف ٹھیٹ ہندی لفظ لکھے گئے ہیں ورنہ اس وقت کی زبان میں بھی فارسی عربی خصوصاً فارسی الفاظ بکثرت شریک ہو گئے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مصنف بعض اوقات یہ بھول جاتا ہے کہ جس لفظ کو وہ ہندی کہتا ہے دراصل فارسی ہے۔ مثلاً لحم گوشت درہندوی جان "کرتہ نام پیراہن جان" "صف گستراں بوریا بچھاؤ" "نام سیاست سزا بکھان" "تازیانہ چابک

ہے جان"۔ ان مصرعوں میں گوشت، کرتہ، بوریا، سزا، چابک فارسی لفظ ہیں جنھیں ہندی سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بعض کے ہندی مترادف مل سکتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ فارسی لفظ زبان میں اس طرح رس بس گئے تھے کہ بہ ظاہر یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کونسا لفظ فارسی ہے اور کونسا ہندی مثلاً کرتہ کا ایسا لفظ ہے کہ جس کی نسبت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ ہندی نہیں۔ یا بوریا ہے جسے عام لوگ یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ لفظ فارسی ہے اس طرح کے بہت سے فارسی اور بعض عربی لفظ ہیں جو زبان زد عام و خاص ہیں اور بولتے اور لکھتے وقت کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ یہ غیر زبانوں کے الفاظ ہیں۔ البتہ بعض لفظ ایسے ہیں کہ ان کے لئے ہندی مترادف ہے ہی نہیں۔ مثلاً خیاط کے لئے درزی لکھا ہے جو فارسی ہے۔ اس کے لئے کوئی ہندی لفظ نہ ملا۔ خالق باری میں بھی درزی ہی لکھا ہے وجہ یہ ہے کہ ہندو تمدن میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مصنف نے عندلیب کا مترادف کوئل لکھا ہے۔ عندلیب کوئل نہیں۔ یہ دو مختلف پرندے ہیں۔ عندلیب ہندوستان میں نہیں ہوتی۔ مصنف نے کوئل کو اس کا قائم مقام سمجھ کر لکھ دیا ہے۔

وفات نامہ حضرت فاطمہ مصنفہ اسمعیل امروہوی کے تبصرے میں میں نے چند مثالیں پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ کہ دکھنی اور گجری یا گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلی سے ان علاقوں میں پہنچی البتہ اُس میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں بھی شامل ہو گئیں اس کتاب سے ایسی مثالیں پیش کرنا ممکن نہیں کیونکہ اُس میں کوئی مسلسل بیان نہیں صرف خاص قسم کے الفاظ سے بحث ہے۔ تاہم اس میں کہیں کہیں ایسے لفظ آ گئے ہیں جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً

اَچھنا، بمعنے ہونا یا رہنا۔ ناٹھنا بمعنی بھاگنا۔

"بمان اچھ بگمریزی ناٹھ"

'نیکا' بمعنی خوب "مزہ سواد خوب ہے نیکا"

آننا، بمعنی لانا "خرقہ بیار جو مکھلی (؟) آن"

اندھاری، بمعنی تاریک "شب تاریک رین اندھاری"۔

اس طرح "پریتم" بمعنے محبوب یا معشوق۔ "پریت" محبت و الفت۔ سوں بجائے سے اور منہ بجائے میں۔

"من بھاون" "من بھاون کہے محبوب۔ جو کچھ مانگے سو مطلوب"۔

مصنف سکندر آباد (ضلع بلند شہر؟) کا رہنے والا ہے جو دہلی سے قریب ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے۔

متصل دارالملک مقام حضرت دہلی نادر نام

اس کی زبان وہی ہے جو دہلی میں اس وقت مروج تھی۔ یہ بظاہر وہی زبان ہے جسے علامی ابوالفضل زبان دہلوی کہتے ہیں اور جو وہاں سے اطراف ملک میں پھیلی۔

ہر عنوان کے آخری شعر میں مصنف اپنا نام ضرور لاتا ہے۔ بھرتی کے الفاظ کم ہیں جیسا کہ اس قسم کی بعض کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

ایک بات یہ پائی جاتی ہے کہ مصنف ہر جگہ اپنی زبان کو ہندوی لکھتا اور کسی ایک موقع پر بھی ہندی نہیں لکھا۔

رسم الخط میں ک اور گ، ت اور ٹ، د اور ڈ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ گ کا کام ک سے، ٹ کا ت سے اور ڈ کا د سے لیا گیا ہے۔ ڑ کی جگہ ر لکھی ہے یا تلفظ کے لحاظ سے ڑ کی جگہ ڈ (یعنی د) استعمال کی گئی۔ جیسے جھاڑ اور گاڑ کو جھاد اور گاد لکھا ہے۔ یہ تلفظ اب بھی بعض مقامات میں جاری ہے۔ علی گڑھ کو عموماً ڈ سے لکھا جاتا ہے یعنی علی گڈھ، اگرچہ بولتے ڑ سے ہیں۔ اسی طرح گدھا، لاڈ اور لاڑ اب بھی مستعمل ہیں۔ ہای دوچشمی کہیں استعمال نہیں کی گئی۔ کاتب کا خط پختہ اور قلم میں زور ہے۔ خط ثلث اور شکستہ سے ملتا جلتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عام دستور ہے۔ نقطے دینے میں بہت بے پروائی کی گئی ہے۔ اس سے الفاظ کے صحیح پڑھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔

کاتب نے آخر میں یہ دو سطریں لکھی ہیں "تمام تمام شد کار من نظام شد۔ بروز جمعے تاریخ ہشتم رجب سنہ ......" سنہ کیڑوں کی نذر ہو گیا ہے۔

شرح تمہید ہمدانی

(اُردو نثر کی ایک بہت قدیم کتاب)

حضرت سیّد میران، جن کو شاہ میران حسینی، میران جی خدانما اور شاہ میران جی سیّد حسن خدانما بھی لکھا ہے، شاہ امین الدین علی (یا اعلیٰ) بیجاپوری کے مُرید تھے کہتے ہیں کہ پہلے وہ ایک سپاہ پیشہ مرد تھے۔ ان کا وطن صوبہ حیدر آباد (دکن) کے ایک قصبے دیناگل میں تھا۔ نہ معلوم کیا خیال آیا اور کیا اُفتاد پڑی کہ دل دُنیا سے بے زار ہو گیا اور تعلقات ترک کر کے حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کی خدمت میں بیجاپور حاضر ہوئے اور مُریدی کا شرف حاصل کیا اور مدتوں ریاضت کی۔ پھر مُرشد کی اجازت سے وارد حیدر آباد ہوئے۔ وہاں اہلِ شہر نے، جو اپنی خوش اعتقادی میں کسی سے کم نہیں عقیدت وارادت کی آنکھیں اُن کے رستے میں بچھائیں۔ مرتے دم تک حیدر آباد ہی میں رہے۔ صاحب روضۃ الاولیا لکھتے ہیں کہ بیرون حصار اُن کا مکان اور روضہ ہے۔ مؤلّف تذکرۂ اولیائے دکن کا بیان ہے کہ وہ "علی آباد کے دروازے کے قریب مدفون ہیں۔ ......اور سالانہ عرس وصندل کا جلسہ عظمت سے ہوتا ہے۔" ان کا سنہ وفات، جہاں تک میں نے تحقیق کیا ہے ۱۰۸۰ھ ہجری ہے۔ لیکن مؤلف تذکرہ اولیائے دکن سنہ ۱۱۲۵ھ

بتاتے ہیں۔ مؤلف موصوف نے سنوں کے بیان میں اکثر بے احتیاطی کی ہے اور تحقیق سے کام نہیں لیا۔ یہ سنہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ خود مؤلف تذکرہ نے سلسلۂ قادریہ میں ان کی بیعت شاہ محمود خوش دہاں (خلیفہ شاہ برہان جانم) سے بتائی ہے، جن کا سنہ وفات (بقول مؤلف) ۹۶۵ھ ہے۔ یعنی سید میران صاحب اُن کے بعد ایک سو ساٹھ سال زندہ رہے۔ یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ بڑی عمر میں مرید ہوئے تھے۔ علاوہ اس کے ان کی کتاب کے سنہ تصنیف یا کتابت سے بھی (جس کا ذکر آگے آئے گا) یہ خیال ہوتا ہے کہ مؤلف تذکرہ اولیائے دکن کا قول قرین صحت نہیں۔

افسوس ہے کہ ان تذکروں میں کہیں ان کی تصانیف کا ذکر نہیں۔ حالاں کہ ہمارے نقطۂ خیال سے ان کی بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب کے مؤلف ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں قدر و منزلت کے لائق ہے۔

اس کتاب کا نام شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید ہے۔ اس کتاب کی حقیقت بتانے سے پہلے تمہید ہمدانی کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تمہیدات عین القضات ایک تصوف کی کتاب ہے۔ جس کے مؤلف ابوالفضائل عبداللہ بن محمد المیان جی ملقب بہ لقب عین القضات ہمدانی ہیں۔ یہ شیخ احمد غزالیؒ (برادر امام محمد غزالی) کے شاگرد تھے۔ سنہ ۵۳۳ ہجری میں بحکم قوام الدین ابوالقاسم درگزینی وزیر سلطان سنجر قتل کیے گئے اور رتبہ شہادت پایا۔

ان کے خاندان کا اصل وطن میانہ تھا جو مراغہ اور تبریز کے درمیان واقع ہے اور اسی نسبت سے وہ میاں جی کہلاتے ہیں۔ ان کے دادا ابوالحسن علی ہمدان کے قاضی تھے جو (بقول یاقوت) شہید ہوئے۔ وہ ایک مشہور فقیہ، عالم اور شاعر تھے۔

تمہیدات کے مصنف عین القضات ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کی شہرت زیادہ تر صوفی کی حیثیت سے ہے۔ اُن کی تصنیف سے فارسی عربی میں کئی کتابیں تصوف پر ہیں۔ علاوہ تمہیدات کے شیخ کی دوسری فارسی کتاب ان کے مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے صوفی دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوں میں تصوف کے مسائل اور

مسائل شرعیہ، عقائد اور قرآن کی بعض آیات کے باطنی معنے بیان کئے ہیں (یہی باتیں تو ان کی شہادت کا باعث ہوئیں) جن صاحبوں کو یہ خط لکھے گئے ہیں ان کے نام درج نہیں، ہر خط "برادر عزیز" سے شروع ہوتا ہے۔ بعض خط " الولد الاعز عین القضات" کے عنوان سے ہیں جو غالباً احمد غزالی (رح) نے شیخ کے نام لکھے ہیں۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔

تمہیدات دس باب (یا اصل) میں منقسم ہے۔ ہر باب کا عنوان "تمہید اصل" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کتاب میں وہی مسائل ہیں جو اُن کے مکتوبات میں بیان کئے گئے ہیں۔ میرے ایک قلمی نسخے کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ اصل کتاب عین القضات کی عربی میں ہے اس کی ایک شرح فارسی میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز نے لکھی ہے۔ سید میراں حیدر آبادی نے اپنی شرح دکھنی زبان میں لکھی ہے۔ یہ صحیح نہیں، اصل کتاب فارسی میں ہے۔ چوں کہ حضرت بندہ نواز کی شرح میری نظر سے نہیں گزری اس لئے وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سید میراں صاحب کی شرح، حضرت بندہ نواز کی شرح کا ترجمہ ہے۔ میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک میں اس کا نام شرح تمہید ہمدانی ہے اور دوسرے میں جو زیادہ قدیم (بلکہ مصنّف کے زمانے کا ہے) شرح شرح تمہید لکھا ہے۔ جس سے یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ یہ حضرت بندہ نواز کی شرح تمہید کی شرح یا اس کا ترجمہ ہے۔ لیکن کتاب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شرح کا ترجمہ یا کوئی جدید شرح نہیں ہو بلکہ اصل تمہیدات کا دکھنی ترجمہ ہے۔ اصل تمہیدات کی ابتدائی سطریں یہ ہیں :۔

> " سپاس بحد وثنائے بیحد مر حضرت آں خدائے را در مبداء الوہیت
> او دیدۂ عقل حیراں ...."

دکھنی شرح تمہید کا آغاز یوں ہوتا ہے :۔

> " اللہ بڑا صاحب، اس کوں بہوت سرانا، بہوت نوازنا۔ اس کی
> خدائی تھی دونو عالم پیدا کرنے میں عقل کی انکھیاں حیران ہیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اصل تمہیدات کا ترجمہ ہے۔ شرح کا لفظ جو اس کتاب

کے ساتھ لکھا ہے، اُسے ترجمے بلکہ بے قید ترجمے کے معنوں میں سمجھنا چاہیئے۔ مجھے اصل تمہیدات اور حضرت بندہ نواز کی شرح تمہید کے نسخے دستیاب نہیں ہوئے ورنہ کسی قسم کا شبہہ باقی نہ رہتا۔ یہ جو اس تمہیدات کی ابتدائی دو تین سطریں اوپر لکھی گئی ہیں وہ ایتھے کی فہرست سے نقل کی گئی ہیں اور وہ اس امر کے وثوق کے لئے کافی ہیں کہ یہ دکھنی کتاب اصل تمہیدات کا ترجمہ ہے۔

میرے پاس اس کتاب کے دو نسخے ہیں۔ سب سے قدیم نسخے میں سنہ کتابت ۱۰۱۲ ہجری لکھا ہے جو یقیناً مؤلف کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے، کیوں کہ کاتب اپنے آپ کو "خادم درگاہ فلک بارگاہ" لکھتا ہے۔ دوسرے نسخے کی کتابت سنہ ۱۰۶۷ ہجری کی ہے۔ سنہ ۱۰۱۲ ہجری کی کتابت سے یہ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ اُردو نثر کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اب ہم مختلف مقامات سے اس کی عبارت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ اس وقت کی زبان کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ابتدا کی چند سطریں ہم اوپر لکھ چکے ہیں آخر کی سطریں یہ ہیں:-

"خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کون کہے کہ تمیں کئے سو کتاب منجے دکھلاؤ۔ تو کتاب دیکھ کر بہوت خوش ہوئے ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کئے۔ ہور اے کہنا بھی میرا چ ہے ہور ظاہر شریعت کا کہنا بھی میرا چ ہے۔ اے یکسیں[1] ایک ملے ہیں۔ تمیں جون پانا ہے یوں پائے۔ وے ہر کسی کون اے نکو کہو، جسے اس کی قدر معلوم ہوگی اسے کہو ہور بھی کوئی طلب رکھے گا تو اسے بھی کہو۔ وے اس جنس سوں تعلیمی دیو جون دور رہتا سو نہنوا رے[2] کون بیرے[3] روٹی کھانے کے لایق کرتے ہیں یوں کرو جون میں کیا ہوں۔ یا بار خدایا کچھ اس حقیقت کا راز منجے معلوم تھا سو بولیا، کیا ہے کہ اس میں مقصود خوب کر تو میں ترے یہاں پناہ منگتا ہوں کہ اس میں خطا ہور خلل ہور سہو منجھتے ہوا ہے

---

[1] باہم [2] بچہ [3] گوشت

سو او سبھے بخش، قاضی عین القضات کی دوستی، ہور بھی کوئی تیری بات میں اسے ہیں، تیرے خاصان انو کی دوستی، اسے سلامتی میں منگتا ہوں"۔

اگرچہ اس قدر عبارت زبان کا انداز سمجھنے کے لئے کافی ہے تاہم مزید صراحت کی غرض سے دو ایک مقام سے چند سطریں اور نقل کی جاتی ہیں:-

"اے عزیزاں اے بات نہیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کئے باج نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کچھ کھوٹ[1] اچھے تو بھی قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوئے باج خدا کے عشق ہیں نا آسک سی ہور دے کہ نا سکسی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے مہیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کا بل نہیں تو اول اپنی پچھانت کر۔ سو اسے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نوازنہارا ہے ہور اُس کا اجالا جالنہار[2] ہے۔ یعنی دوست سو نوازنہارا ہور خوبیاں دینہارا، وے اُس کا محبت اُسے ڈگداتا[3] ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو گا لتا[4] ہے اس کے فراق میں۔ اے مقام ایسا ہے جو عاشق معشوق یاج جی نہ ہو سکے۔ باج دیکھے معشوق کا صورت عاشق کیاں انکھیاں کوں جالتا[5] ہے ہور اپنا رنگ کرتا ہے۔"

"افسوس سب خلق قرآن کا ظاہر معنا سمجھے ہور تسلی ہوے۔ اے سب قرآن کا چھوڑا چھلکا[6] دیکھے وے مغز نہیں چاکھے۔ نبی کہے قرآن کندوری[7] ہے خدا کی زمین۔ نبی علیہ السلام تھی سن اس جماعت کوں کیا منہا دیتے۔ خدا کہیا۔ قولہ تعالیٰ "یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا"۔ اس کا معنا یا بار خدا تحقیق اے جماعت قرآن پھوڑا نکلے ہیں"۔

(رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۲۹ء)

---

[1] نقص [2] جلانے والا [3] ڈگمگانے [4] گلاتا ہے [5] جلاتا ہے [6] چھلکا [7] دسترخوان

مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ

(شمالی ہند کی قدیم ترین مثنوی)

جنوبی ہند یعنی ریاست حیدرآباد دکن، بیجاپور، گجرات میں قدیم اُردو (یعنی دکھنی اور گجری) کی بے شمار نظم کی کتابیں ملتی ہیں جن کا سلسلہ آٹھویں صدی سے شروع ہوتا ہے ان میں سے بہ کثرت مثنویاں ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ مرثیے، قصیدے، غزلیں غرض ہر صنف کا کلام پایا جاتا ہے۔ ان میں بعض بہت بلند پایہ ہیں۔ لیکن شمالی ہند میں اس قسم کا کوئی سرمایہ نہیں حالانکہ زبان یہیں سے جنوب پہنچی اور پھولی پھلی۔ شمالی ہند میں مغلیہ حکومت کی وجہ سے فارسی کا زور آخر تک رہا۔ اگرچہ بول چال کی زبان وہی تھی جو ہندی ہندستانی ریختہ، اُردو کے ناموں سے موسوم ہوئی۔ چنانچہ قدیم ملفوظات میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

شمالی ہند میں اس وقت تک جو پرانی اُردو کتابیں دستیاب ہوئیں ان میں سب سے پرانی کتاب جو مجھے ملی ہے وہ "مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ" ہے۔ اس کے مصنف کوئی اسمٰعیل ہیں جوامروہہ کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ مثنوی کے آخر میں وہ خود لکھتے ہیں۔

نبی پیروی بچہ رہ اسمعیل　　قیامت کوں بخشے گا رب الجلیل
وطن امروہہ میرا ہے شہر نام　　اُسی جاۓ پر میرا ہے گا قیام
دہلی کے گرد بیچ وہ شہر ہے　　ندی سوت کی بھی وہاں لہر ہے

اس کے بعد سنہ تصنیف لکھا ہے۔

مہینا جو رجب مرجب اتھا　　ابھی تاریخ پچیسویں ماہ تھا
اٹھے سال ہجری نبی کے عیاں　　گیارہ سو اوپر پانچ تھے بوجھ جان
جو دن چارشنبہ بوقت ظہر　　قصہ پورا کیتا بہوت فکر کر

ولی کا سنہ وفات ۱۱۲۰ یا ۱۱۱۹ھ ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ولی کی وفات سے پندرہ برس پہلے لکھی گئی ہے اور مصنف ولی کا ہم عصر ہے ادبی اعتبار سے اس کتاب کی کوئی حیثیت نہیں، بہت ہی معمولی درجے کی ہے لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دلی کے آس پاس کے اضلاع اور قصبات کی زبان کیسی تھی حسب معمول ابتدا حمد سے ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

الٰہی توں صاحب ہے سنسار کا　　ہمن کوں ہے امید دیدار کا
ترا نام ہردم کوئی لیوتا　　ٹھکانا جنت بیچ اوس دیوتا
جو چاہے کیے توں جو سمرت دھنی　　بندے ہم جو عاجز توں قادر غنی
کری پیدا خلقت تنے ٹھار ٹھار　　کتی شے جو غائب کئے آشکار
مارے توں جلاوے بھی اختیار ہے　　ترے کام کرنے نہ کچھ بار ہے

حمد کے بعد چند شعر نعت و منقبت میں ہیں اور اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس میں حضرت فاطمہ کی ولادت، عقد اور آخر میں وفات کا ذکر ہے۔

مثنوی کی زبان دکنی اُردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جمع کا طریقہ افعال کی ساخت ضمائر کا استعمال اور قدیم الفاظ دونوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں جنھیں ہم دکن سے منسوب کرتے ہیں دونوں جگہ ایک سی تھیں، سوا بعض خاص الفاظ کے جو گجراتی اور دکن کی مقامی زبان سے داخل ہو گئے تھے۔ بول چال کی زبان جو جنوب اور

شمال میں تقریباً ایک تھی۔ تحریر میں وہی آگئی۔ ذیل کی چند مثالوں سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔

دھویا آنگ سارا اسی آب تھے ۔۔۔ لے کر فاطمہ کوں انو پاس تھے

اس شعر میں انو ضمیر ہے بجائے اُن کے۔ تھے اور سے دکنی زبان میں عام طور پر "سے" کے معنوں میں آتا ہے۔ انگ کی جگہ آنگ اب تک دکن میں مستعمل ہے۔

کر تھا آب کوثر اُسی کاچ نام ۔۔۔ وہی آب ابریق موں تھا تمام

دوسرے مصرع میں اُسی کاچ میں جو چ ہے یہ دکنی اور گجراتی زبانوں کی خصوصیت میں سے ہے۔ یہ ہی کے معنوں میں آتا ہے اور فعل، ضمیر، اسم، صفت سب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ہی مستعمل ہے۔ موں، منے، منیں "میں" کی بجائے استعمال ہوتے ہیں۔

بی بی کوں وہیچ ایتا دیتا چ سب ۔۔۔ دو پشمین تکیے اتھے وہ عجب

اتھا، تھا۔ اتھے، تھے۔ وہیچ، وہی۔ ایتا، اتنا۔

جب پھر نے لے کر آئیا ۔۔۔ بہوت ڈھونڈیا گھر کوں نہ کچھ پائیا
اجر اس کا حق نے بھی دیتا تجھے ۔۔۔ کتا ہے جبا کہہ نہ دیتا مجھے

ڈھونڈیا اور پائیا، آئیا، دکھنی فعل ماضی مطلق واحد غائب کی صورت ہے۔ پھرنا، پہننا۔ کتا ہے، کہتا ہے۔ دیتا ہے معنی دیا ہیں۔

ہمارا دنی بیچ کیا ہوے حال ۔۔۔ جدا ہو ہمن سے چلے تم ایتال

ہمن اور تمن، ہم تم کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ دنی، دنیا۔ ایتال کے معنی اب ہیں۔ دکنی کتابوں میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

اپس میں یکس کا یکس منہ جوتے ۔۔۔ دیکھیں کیا دونو بھائی بیٹھے لڑتے

یکس کا یکس یعنی ایک کا ایک (ایک دوسرے کا) یہ خاص دکنی استعمال ہے جونا کے معنے دیکھنے، ڈھونڈنے کے ہیں۔

کھڑے ہیں جنت کے دروازے اوپر ۔۔۔ علی خواب میں بی بی دیکھے نظر

علی دیکھے اور (بی بی فاطمہ) کھڑے ہیں۔ یہ طرز بیان و گفتگو اب بھی دکن میں مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ بیگم صاحب آئے۔ بیگم صاحب دیکھے۔

بی بی ایک صندوق پر سیوا کر — بہشت تے حیدؔ کو دیا کاڑ کر

کاڑنا، نکالنا۔ تے (سے)۔ سے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کی ابتدا میں امروہے اور دلی کے آس پاس کے اضلاع کی زبان کا کیا رنگ تھا۔ جب ہم اس زبان کا مقابلہ دکنی زبان سے کرتے ہیں تو ان میں کوئی خاص فرق نہیں نظر آتا۔ دونوں کے افعال اور ضمائر وغیرہ ایک ہیں۔ بہت سے ہندی یا ہندی سے بگڑے ہوئے لفظ دونوں کے ہاں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ خیال جو بعض حلقوں میں پایا جاتا ہے کہ دکنی زبان الگ ہے صحیح نہیں۔ وہ زبان جو محمد تغلق اور اس کے قریب زمانے میں دکن پہنچی وہی تھی جو دلی اور اس کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی۔ البتہ لہجے اور تلفظ میں کچھ فرق ہو گیا اور کچھ لفظ گجراتی اور دکنی کے داخل ہو گئے مگر اس سے زبان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔

(رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۵۱ء)

سب رس

از مُلّا وجہی

کچھ[۱] ہی دنوں پہلے تک "ولی" اُردو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا اور بعض کو اب بھی اس پر اصرار ہے۔ پرانی باتیں دل سے نکلتے ہی نکلتی ہیں۔ لیکن تحقیق سے اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ "ولی" سے بہت پہلے اُردو کے بہت اچھے اچھے شاعر ہو گزرے ہیں۔ اسی طرح اب تک اُردو نثر کی پہلی کتاب "فضلی" سے منسوب کی جاتی تھی اور اس کی "کربل کتھا" اُردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر پردۂ خفا میں تھیں۔ تحقیق و جستجو نے اب انھیں گمنامی سے نکالا ہے۔ انھیں میں سے ایک قابلِ قدر کتاب "سب رس" ہے۔

ہر زبان میں (زمانے کے لحاظ سے) نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے۔ اس کے یہ معنے

۱۔ یہ مضمون پہلی بار رسالہ "اردو" (اکتوبر ۲۴ء) میں شائع ہوا تھا اس کے بعد "سب رس" مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا۔

نہیں ہیں کہ لوگ پہلے اُردو ناٹکوں کی طرح نظم ہی میں گا گا کر باتیں کرتے تھے بلکہ اس سے یہ مطلب ہے کہ ادبی نظر سے پہلے نظم کہی یا لکھی گئی اور نثر لکھنے کا رواج بہت بعد میں ہوا۔

بات یہ ہے کہ . . . انسان ابتدا میں زیادہ تر جذبات اور جبلت کا تابع تھا۔ اب بھی جہاں کہیں تمدن نے اپنی پرچھائیں نہیں ڈالی، وہاں لوگ جذبات کی پوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ عقل دیر میں آتی ہے اور مشکل سے آتی ہے اور اس کا جذبات پر غالب آنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ جذبات کا اظہار نظم ہی میں خوب ہوتا ہے۔ انسان کا پہلا کلام گیت ہے۔ گانا اور ناچنا انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے۔ فطرت میں ہر جگہ ناچ اور گانا نظر آتا ہے۔ موزونیت دونوں کی جان ہے اور انسان کے اولین جذبات بے تکلفی اور سادگی سے انھیں کے طفیل میں ظاہر ہوئے اور اب تک ہر قوم میں ہمتمدن ہو یا غیر متمدن، یہ اس کی مسرت ولطف کا سامان ہیں اور جب تک سائنس جذبات کو بالکل کچل کر اسے مشین کا پتلا نہ بنا دے یہ یوں ہی رہیں گے۔ اگرچہ اردو کا نشو ونما اس وقت ہوا جب کہ ملک اعلیٰ درجہ کا متمدن تھا لیکن یہ فارسی اور ہندی کی پروردہ تھی۔ دونوں شاعری کی زبانیں ہیں۔ یہ بھی اُسی رستے پر پڑلی۔ اس کی ابتدا بھی نظم ہی سے ہوئی اور نثر بعد میں آئی، یہاں تک کہ بعض علمی کتابیں بھی نظم ہی میں لکھی گئیں اور یہی تقریباً ہر زبان میں ہوا ہے۔

سب رس مصنفہ "وجہی" ہے۔ یہ عبداللہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ قطب شاہی بادشاہوں کے عہد میں دکنی یعنی قدیم اُردو کو بہت فروغ ہوا۔ یہ علم و ہنر کے بڑے سرپرست تھے۔ شعراء اور علما ان کے دربار کی رونق تھے۔ خود ان میں سے بعض بڑے پایہ کے شاعر ہوتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ) کا ضخیم کلیات اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری پر دلالت کرتا ہے۔ اُردو میں اس سے قبل کا ایسا پاکیزہ کلام دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ تا سنہ ۱۰۳۵ھ) بھی اردو کا بہت اچھا شاعر ہوا ہے اور اس کا دیوان موجود ہے۔ اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ) بھی اپنے باپ دادا کی طرح

اُردو کا شاعر تھا۔ اس کے عہد میں علم کا بہت چرچا تھا اور بعض بڑے بڑے فاضل اور شاعر اس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی لغت کی مقبول اور مشہور کتاب برہان قاطع اسی کے عہد میں لکھی گئی۔ طب کی بعض کتابیں اسی زمانے کی تالیف ہیں اور اسی بادشاہ کے نام سے منسوب ہیں۔ ملا نظام الدین احمد نے حدیقۃ السلاطین اس کے حالات میں لکھی ہے اس کے علاوہ اس کے عہد کے بہت سے علمانے اپنی کتابیں اسی بادشاہ کے نام سے معنون کی ہیں، جس سے اس کی علم پروری اور علمی ذوق کا پتہ لگتا ہے ملا غواصی مصنف "سیف الملوک" و "بدیع الجمال" اور ابن نشاطی مصنف "پھول بن" اسی کے دربار کے شاعر تھے۔ یہ کتاب سب رس بھی وجہی نے عبداللہ قطب شاہ ہی فرمائش سے لکھی تھی - چنانچہ وہ خود اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے۔

"سلطان عبداللہ، ظل اللہ، عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پرور، ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر، دل کے خطرے تے باخبر۔۔۔ صبا کے وقت بیٹھے تخت، یکا یک غیب تے رمز پا کر دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادر من کون، دریا دل گو ہر سخن کوں، حضور بلائے پان دیلے، بہت مان دیلے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجود یچہ میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا ناؤں عیاں کرنا، کچھ نشان دھرنا وجہی بھوگنی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پہ ہات دھریا، بہوت بڑا کام اندیشیا، بہت بڑی فکر کریا۔ بلند ہمتی کے بادل نے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا، قدرت کے اسراراں برسایا، بادشاہ کے فرمائے پر چنیتیا، نوی تقطیع بیتیا۔"

"سب رس" کے علاوہ میرے پاس وجہی کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک "تاج الحقائق" یہ بھی نثر میں ہے اور اس میں اخلاق و تصوف پر بعض مباحث ہیں اور "سب رس" کے بعض مقامات سے جہاں اس نے اسی قسم کی بحثیں چھیڑ دی ہیں، بہت ملتے جلتے ہیں۔ دوسری ایک مثنوی "قطب مشتری" ہے۔ اس میں بادشاہ وقت ابراہیم قطب شاہ کے بیٹے، سلطان قلی قطب کے عشق و محبت کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس کا سنہ ۱۰۱۸ ہجر

تصنیف جیسا کہ اس نے خود کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے سنہ ۱۰۱۸ھ ہے۔ ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی کہ اس مثنوی میں وہ ہر جگہ اپنا نام "وجہی" لکھتا ہے البتہ اس مثنوی میں ایک عنوان کے یہ الفاظ ہیں "وجہی تعریف شعر خود گوید" ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کے نہیں ہو سکتے کسی دوسرے کے ہیں، لیکن "سب رس" میں جہاں کہیں اس کا نام آیا ہے وہاں "وجہی" لکھا ہے۔ کم سے کم اس کے پانچ نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ان سب میں "وجہی" پایا گیا حدیقۂ قطب شاہی میں جہاں اس کا ذکر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کی تاریخ ولادت کے ضمن میں آیا ہے وہاں صاف طور پر "وجیہی" لکھا ہوا ہے[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "وجہی" اور "وجیہی" دونوں طرح اپنا نام لکھا ہے۔ اس مثنوی میں ابراہیم قطب شاہ کی مدح اور سلطان قلی قطب شاہ کی ولادت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا اس نے قطب شاہیہ کے چار بادشاہوں کو دیکھا تھا اور یہ کتاب اس نے عبداللہ قطب شاہ کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے آخر زمانے میں لکھی "سب رس" کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے۔ چنانچہ خاتمۂ کتاب میں لکھتا ہے "بارے جس وقت تھا ایک ہزار چہل دپنج، اس وقت ظہور پکڑیا یہ گنج" یعنی اس نے "سب رس" مذکورہ مثنوی سے ۲۷ برس بعد لکھی، اس وقت اس کی عمر اچھی بڑی ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس کتاب میں کہیں اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے شاعر ہونے میں شبہ نہیں سب سے بڑی شہادت تو یہ مثنوی ہے۔ دوسری شہادت "حدیقۂ قطب" سے ملتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ "سب رس" میں بھی اپنے اشعار اور غزلیں جا بجا نقل کرتا ہے۔ اب میں کتاب کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ قصہ بھی عجیب ہے اور طرزِ بیان بھی عجیب۔ مصنف نے ایک کام عالم گیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا

---

[1] وجیہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کے تولد ہونے پر یہ تاریخ کہی۔
"آفتاب از آفتاب آمد پدید" (۱۰۴۱ھ)

ہے اور حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے یہ بڑے مزے کا قصہ ہے اور کون ہے جو اس کوچے سے نا آشنا ہو اور جس نے اس معرکہ میں چوٹ نہ کھائی ہو۔

" وجہی " نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ قصہ اسے کہاں سے ملا۔ دیباچہ پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اسی کی ایجاد ہے اور اسی کے دماغ کی اپج ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ پر لطف داستان سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے لکھی۔ یہ نیشاپور علاقہ خراسان کے مشاہیر میں سے اور شاہ رخ مرزا کے عہد میں تھے انتقال کی تاریخ سنہ ۸۵۲ھ ہے۔ تخلص فتاحی ہے۔ اس تخلص کے رکھنے میں بھی انھوں نے خاص جدت اور تکلف سے کام لیا ہے۔ یہ سیبک سے تراشا گیا ہے۔ جو ان کے نام کا جزو ہے سیب کو عربی میں "تفاح" کہتے ہیں اور تفاح کو تقلیب کیا تو "فتاح" بنا اور اس سے "فتاحی" اپنا تخلص قرار دیا۔ اس کے علاوہ اسراری اور خماری بھی تخلص کرتے ہیں۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ یہ بہت فاضل اور قادر الکلام شاعر تھے لیکن چونکہ طبیعت میں قناعت تھی اور دربار کی گوں کے نہ تھے اس لئے ان کا کلام زیادہ مشہور نہ ہوا۔ علاوہ دیوان کے ان کی کئی تصنیفات ہیں ان میں سے ایک "دستور عشاق" یعنی حسن و دل کا قصہ ہے۔

دستور عشاق مثنوی ہے جس میں پانچ ہزار شعر ہیں۔ اس قصے کو مصنف نے "شبستان خیال" اور "حسن و دل" کے نام سے الگ الگ بھی لکھا ہے لیکن یہ دونوں دستور عشاق کے بعد لکھی گئی ہیں۔

حسن و دل جو بہت مشہور ہوئی نثر میں دستور عشاق کا خلاصہ ہے اس کی نثر مسجع اور مقفیٰ ہے اور صنائع اور بدائع کی اس میں خوب داد دی ہے۔ یہ کتاب یورپ میں تین بار چھپی اور ترجمہ ہوئی۔ سب سے پہلے آرتھر براؤن (ڈبلن) نے سنہ ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا۔ دوسرا ترجمہ ولیم پرائس نے ۱۸۲۸ء میں شائع کیا اور سب سے آخر میں جرمن ڈاکٹر روڈالف دوراک نے وی اینا (VIENNA) اکاڈیمی کی روئداد (سنہ ۱۸۸۹ء جلد ۱۱۸) میں مع ترجمہ کے شائع کیا۔ انگریزی کے دو ترجمے تو یونہی ہیں لیکن اس جرمن ڈاکٹر

نے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے کتاب پر عالمانہ اور تنقیدی مقالہ لکھا ہے اور قصّے کا خلاصہ بھی لکھ دیا ہے اور ترکی شاعر لامعی (سنہ وفات ۹۳۸ھ یا ۱۵۳۱ع) کی داستان سے بھی جس نے اسے اپنی زبان میں لکھا ہے اس قصّے کا مقابلہ کیا ہے تین اور ترکی شاعروں نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک تو آہی (سنہ وفات ۱۵۱۷ع) اور دوسرا "والی" ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا ہے اور تیسرا "صدقی"۔ لامعی اور آہی کی کتابیں نثر میں ہیں۔ اور والی اور صدقی کی نظم میں۔ آہی کی کتاب نا تمام ہے اور اس کی نثر نہایت درجہ مسجع و مقفیٰ اور دقیق ہے۔ سوائے صدقی کے باقی سب نے قصے میں اپنی طرف سے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔[1] ہندوستان بھی اس سے خالی نہیں۔ عہد عالمگیر میں ۱۰۹۵ھ میں خواجہ محمد بیدل نے اس قصے کو پر تکلف نثر میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ جدت کی ہے کہ قصے کے اشخاص کو خطابات بھی عطا فرمائے ہیں جس سے تمثیل کا لطف جاتا رہا ہے۔

مذکورہ بالا حالات میں نے مسٹر آر۔ ایس۔ گرین شیلڈس (آئی۔ سی۔ ایس) کی کتاب "دستور عشاق" کے مختصر دیباچے سے اخذ کئے ہیں جو انھوں نے جرمن ڈاکٹر کے مقدمے سے (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) نقل کئے ہیں۔ مسٹر گرین شیلڈس نے اصل فارسی نسخہ سنہ ۱۹۲۶ع میں شائع کیا۔

لیکن ہندوستان میں بھی حسن و دل کے نام سے اسی قصّے کو ایک شاعر نے فارسی زبان میں نظم کیا ہے جس کا ذکر یورپین مترجموں نے نہیں کیا۔ اس کے مصنف داؤد الجی ہیں جنھوں نے اپنی مثنوی حسن و دل سنہ ۱۰۵۴ھ میں نظم کی۔[2] یہ کتاب بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے۔ اردو میں بھی کئی شاعروں نے اسے نظم کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ان تمام مصنفوں نے اس قصے کے بیان کرنے میں، خواہ نثر میں ہو یا نظم میں،

---

[1] ملاحظہ ہو ہسٹری آف اوٹومن پوئٹری مصنفہ گب، جلد دوم صفحہ ۹۲ تا ۲۹۶۔ [2] حاشیہ اگلے صفحے پر

مولانا فتاحی سے خوشہ چینی کی ہے۔ گو ملا "وجہی" نے قصے کی اصل کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا مگر دونوں کتابوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے قصہ کی واردات حرف بحرف فتاحی سے لی ہے اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا ہے تو یہ کہ جا بجا موقع بے موقع پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں نام و نشان نہیں۔

میرا قیاس یہ ہے کہ وجہی کو فتاحی کی حسن و دل جو نثر میں ہے ہاتھ لگ گئی تھی اور دستور عشاق اس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وجہی نے اپنی نثر میں اُسی کا طرز اڑایا ہے اور مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ

(پچھلے صفحے کا حاشیہ)۔ کتاب کی وجہ تالیف یہ بیان کی ہے۔

بسے ہست منظوم افسانہا — بلطف عبارت چو در داہنا
ز ہر نکتہ سنجی در اطوار عشق — بطرزے کہ بنماید آثار عشق
ولے اینچی با پریشاں دلی — سرے پر ز سودائے بے حاصلی
بری از تکلف بطرز غریب — ادا می کند قصۂ بس عجیب

کتاب کے آخر میں یہ اشعار ہیں اور پانچویں شعر میں سنہ تالیف مذکور ہے۔

بگو حمد للہ کہ ایں گفت گو — بسر حد انجام آورد رو
دل و حسن گشتند از عشق شاد — گرفتند از و ہم کمال مراد
نتائج از ایشاں بسے حاصل است — شناسد کسے کو بحق واصل است
یکے زاں نتائج بود این کتاب — کہ حسن و دلش نام شد از صواب
ز ہجر نبیؐ زکی در شمار — گذشتہ ہزار است پنجاہ و چار
کہ ترتیب ایں نظم ترتیب دید — نکو داستانے بآخر رسید

آخری دو شعر یہ ہیں۔

قلم رفتہ رفتہ بایں جا رسید — ز سر گشتگیہائے خود آرمید
درود نبی گشت آخر کلام — علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

جن امور کا ذکر دستور عشاق میں مفصل ہے اور نثر کے خلاصے میں سرسری یا برائے نام ہے ان کی تفصیل وجہی کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً جب حسن و دل کی شادی ہوتی ہے تو وہاں فتاحی نے دف دگل چنگ و بنفشہ، نرگس و کاسہ چینی کے بڑے پُر لطف مناظرے لکھے ہیں۔ نثر کی کتاب میں ان کا ذکر نہیں، سب رس میں بھی یہ نہیں پائے جاتے، اور اس تقریب میں قامت اور زلف اور دیگر امرا کی طرف سے جو دعوتیں اور مہمانداریاں ہوئی ہیں اس کا بھی کوئی مذکور نہیں۔ اور آخر میں جب گلشن رخسار میں خضر سے ملاقات ہوتی ہے تو وجہی نے صرف چند ہی سطروں میں یہ ملاقات ختم کردی ہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری باتیں ہو جاتی ہیں اور زبان سے کسی کلمے کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن بخلاف اس کے دستور عشاق میں خضر دل کو ایک پرمعنی اور پُرمعارف تلقین کرتا ہے۔ سب رس میں قصّے کا خاتمہ مُبہم بلکہ مبہم ہو کے رہ جاتا ہے دستور عشاق میں فتاحی خضر کی زبان سے تمام اسرار کی حقیقت کھولتا ہے اور بتاتا ہے کہ "تو" کیا ہے۔ زرق، توبہ اور زہد کون ہیں، نظر، ہمّت، رقیب، قامت، زلف، وفا اور غیر سے کیا مطلب ہے، گلشن رخسار اور شہر دیدار کیا ہیں اور عقل و عشق کی کیا حقیقت ہے۔ غرض تمام تمثیل پر سے جو ہم پڑھتے آئے ہیں آخر میں مجاز کا پردہ اُٹھا دیتا ہے اور حقیقت کا جلوہ دکھا دیتا ہے اور جن چیزوں کو ہم قصہ سمجھتے تھے وہ معارف کے رنگ میں نظر آنے لگتی ہیں اور اس ترکیب سے داستان کے تمام اسرار حل ہو جاتے ہیں۔ آب حیات جس پر قصے کی بنیاد ہے اور جس کی آرزو میں تمام فتنے اور فساد برپا ہوتے ہیں اور طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی ہیں وہ سب رس میں آخر تک مُبہم سا رہتا ہے اور تمثیل کسی قدر ناقص اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ دستور عشاق میں خضر نے اس گتھی کو بھی سلجھایا ہے اور تمثیل کی تکمیل کردی ہے۔ اگرچہ شروع میں ایک جگہ وہ آب حیات کے متعلق یہ کہتا ہے۔

بگفت آب کن از عین شریعت   کہ این است آب حیوان در حقیقت

لیکن فتاحی نے گلشن رخسار میں سرچشمہ فم کی نشان دہی کی ہے اور اس

چشمے پر جو سبزہ اُگا ہوا ہے اُسے خضر سے تعبیر کیا ہے اور نم یعنی منہ ہی وہ جگہ ہے جہاں سخن پایا جاتا ہے اور یہ سخن آبِ حیات ہے۔ وجہی نے بھی منہ ہی کو آبِ حیات کا چشمہ بتایا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:" تماشہ دیکھتے دیکھتے رخسار کے گلزار میں آئے دہن آبِ حیات کا چشمہ پائے ہمت نے بھی یہی پتہ دیا تھا، مگر فتاحی نے اسے زیادہ صاف کر دیا ہے وہ دہن کو چشمہ اور سخن کو آبِ حیات بتاتا ہے، اور پھر اس کی تعریف میں یوں نغمہ زن ہوتا ہے۔

سخن روح اللہ پاکست دراسم — زحق القائے او با مریم جسم
سخن دُرّ لیست از دریائے اعظم — سخن نور لیست در مشکاۃ آدم
سخن علم لدنّی را نشان ست — کہ از تعلیم علمہ البیان ست
سخن "آبِ حیات" ست از کرامت — کہ زو زندہ ست تا روز قیامت

اب اس کتاب (سب رس) کو حسن و دل کا فرزند ہونا سزاوار ہے جس پر قصے کا خاتمہ ہے۔

قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عقل و عشق کا معرکہ ہے اور دوسری طرف دل اور حسن کا۔ عقل مغرب کا بادشاہ اور عشق مشرق کا۔ عقل کا ملک یونان (بقول وجہی سیستان) تھا۔ حسن عشق کی بیٹی اور دل عقل کا فرزند ہے۔ بیٹا جب سیانا ہوا تو باپ (عقل) اسے شہر تن (بدن) کا والی بنا دیتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دل کا ایک مصاحب آبِ حیات کا قصہ پڑھ کر سناتا ہے۔

دل کو آبِ حیات کا ذکر سن کر اس کے حاصل کرنے کی دُھن لگتی ہے اور اس کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوتا ہے کہ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا جاسوس نظر اس کی تلاش میں نکلتا ہے اور رستے میں اسے ایک خوش منظر اور خوش حال شہر ملتا ہے جس کا نام عافیت اور اُس کے بادشاہ کا نام ناموس ہے۔ وہ ناموس سے ملاقات کرتا ہے اور اپنے سفر کا مقصد بیان کر کے رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ ناموس کہتا ہے کہ آبِ حیات کی کوئی حقیقت نہیں یہ فسانہ ہے۔ اصل آبِ حیات انسان کی آبرو ہے۔ نظر

مایوس ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ چلتے چلتے ایک عظیم الشان پہاڑ کے قریب پہنچتا ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام زہد ہے اور ایک بڈھے زرق نامی کا آشیانہ ہے۔ اس کی خدمت میں حاضر ہوا آبِ حیات کا نشان پوچھا۔ اس نے کہا کہ آبِ حیات دنیا میں کہاں وہ تو بہشت میں ہے۔ ہاں اگر اس کی تلاش ہے تو عاشقوں کے آنسوؤں میں ڈھونڈھو یہ بات اُس کے دل کو نہ لگی اور وہاں سے مایوس ہو کر آگے چلا تو ہدایت نام ایک سربفلک کوٹ دیکھا جس کا بادشاہ ہمت تھا اس نے البتہ کچھ ہمت بندھائی اور آبِ حیات کا پتہ بتایا اور کہا کہ کوہِ قاف کے اُس طرف ایک شہر ہے جس کا نام دیدار ہے اس میں ایک باغ ہے جس کا نام رخسار ہے اس باغ میں ایک چشمہ دہن ہے اور اسی چشمے میں "آبِ حیات" ہے جس کی تجھے تلاش ہے اور ایک سفارشی خط اپنے بھائی قامت کے نام دیا اور یہ بھی کہا کہ وہاں پہنچنا بہت دشوار ہے۔ شہر دیدار کا نگہبان ایک دیو رقیب نامی ہے وہ کسی غیر آدمی کو گھسنے نہیں دیتا۔ غرض بہ ہزار دقّت جب کہ وہ رقیب کے شہر سگسار میں پہنچا تو نگہبانوں نے اسے قید کر لیا اور رقیب کے پاس لے گئے۔ رقیب بہت بگڑا اور کہا تو یہاں کیسے آیا؟ نظر نے جب دیکھا کہ جان کا خطرہ ہے تو کہا میں بڑا حکیم اور کیمیا گر ہوں۔ رقیب کو لالچ نے گھیرا اور سونے کی طمع میں اسے بڑی خاطر سے اپنے پاس رکھا۔ جب سونا بنانے کی فرمائش کی تو نظر نے کہا بعض دوائیں صرف شہر دیدار میں ملتی ہیں وہاں لے چلو تو سونا بنا دوں گا۔ وہاں گیا تو قامت سے ملاقات ہوئی۔ ہمت کا خط دیا اور اس کی مدد سے چھپ کر رقیب کے پنجے سے رہائی پائی اور شہر دیدار کا قصد کیا۔ رخسار کے گلزار میں پہنچا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ قضا کار حسن کی ایک سہیلی لٹ (زلف) وہاں سیر کرنے آئی تھی۔ اس کی آنکھ جو نظر پر پڑی تو برہم ہو کر بولی کہ تو کون ہے اور یہاں کیسے آیا ہے؟ یہ بہت گھبرایا اور منت عاجزی کی اور کہا میں مصیبت زدہ ہوں، یہاں تک آ گیا ہوں خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو۔ اُسے ترس آیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ رخصت کرتے وقت اپنے کچھ بال دیئے اور کہا جب تجھ پر کوئی مصیبت آئے تو یہ بال آگ پر رکھ دینا میں فوراً تیری

مدد کو آجاؤں گی۔ زلف سے وداع ہو کر پھر شہر دیدار کی طرف چلا اور تھوڑی دیر میں رخسار کے گلزار میں پہنچ گیا۔ وہاں کا نگہبان غمزہ تھا، غمزہ نظر کا بھائی تھا لیکن بچپن میں جدا ہو گئے تھے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔ غمزے نے جو غیر شخص کو گلزار میں دیکھا تو فوراً جھپٹ کر اُسے گرفتار کر لیا اور قتل ہی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر بازو بند پر پڑی۔ ان کی ماں نے بچپنے میں نشانی کے لئے دونوں کے بازوؤں پر ایک ایک لعل باندھ دیا تھا، دیکھتے ہی وہ نظر سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ دونوں بھائی ملے نظر نے اپنا سب احوال سُنایا۔ غمزہ حسن کا مصاحب تھا وہ اسے حسن کے پاس لے گیا۔ حسن کے پاس ایک نہایت خوش رنگ بے بہا لعل تھا جس پر ایک خوبصورت موہنی مورت بنی ہوئی تھی، اس نے پرکھنے کیلئے نظر کو دکھایا۔ وہ دیکھ حیران ہو گیا اور کہا کہ یہ صورت تو دل کی ہے یہ سُنتے ہی حسن دل پر عاشق ہو جاتی ہے۔ نظر نے کہا کہ دل کو آبِ حیات کی بڑی جستجو ہے اور اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے یہ مل جائے تو میں دل کو تیرے پاس لے آتا ہوں۔ حسن نے اپنے غلام خیال کو نظر کے ساتھ کیا اور ایک یاقوت کی انگوٹھی ان کو دی جس سے آبِ حیات کے چشمے پر مہر کی جاتی تھی۔ خیال اور نظر شہر بدن میں پہنچ کر دل سے ملتے ہیں۔ دل کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے خیال حسن کی تصویر کھینچ کر دل کو دکھاتا ہے تو دل ہزار جان سے حُسن پر عاشق ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر نظر کے مشورے سے شہر دیدار کے سفر کا قصد کرتا ہے۔ دل کے باپ بادشاہ عقل کا وزیر وہم نامی اپنے آقا کا بڑا خیر خواہ تھا اسے جب یہ خبر ہوئی تو اس نے فوراً بادشاہ سے ساری باتیں جا لگائیں اور کہا کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ہے اور دونوں شہزادۂ دل کو شہرِ دیدار کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کر دیں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے۔ ابھی بادشاہ عشق سے صلح ہوئی ہے۔ باہم قول و قرار ہوئے ہیں۔ اگر لڑائی ہوئی تو بہت بُرا ہوگا۔ عشق بہت قوی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ عقل اس خبر کے سُنتے ہی سخت پریشان ہوا اور وہم کے مشورے کے مطابق دل اور نظر کو قید کر دیا اور پہرے بٹھا دیئے۔

یاقوت کی وہ انگوٹھی جو حسن نے دل کو اپنے عشق کی نشانی بھیجی تھی۔ کسی مصلحت سے دل نے نظر کو دیدی تھی۔ اس کی ایک خاصیت یہ تھی جو کوئی اُسے منہ میں رکھ لے تو سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے وہ سب کو دیکھے اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر نظر، عقل بادشاہ کے بند سے باہر نکل آیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا اور جلد جا پہنچا۔ سیر کرتے کرتے رخسار کے گلزار میں گزر ہوا، وہاں ایک چشمہ جسے آب حیات کہتے ہیں پایا، ..... لالچ میں آکر چاہتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے انگوٹھی منہ میں سے نکل کر چشمے میں جا پڑی اور آب حیات کا چشمہ نظر سے غائب ہو گیا۔ اتنے میں رقیب کی نظر اس پر پڑی وہ تاک میں تھا ہی فوراً جکڑ کر باندھ لیا اور گھر بھیج کر قید کر لیا۔ یہ ان کے کرتوت کا نتیجہ تھا۔ سخت پریشان حال اور بے قرار تھا کہ ایک دن لٹ کے بالوں کا خیال آیا، ایک دو بال لے کر آگ پر رکھے، بالوں کا آگ پر رکھنا تھا کہ فوراً لٹ آ پہنچی۔ حال پوچھا اور کسی حکمت سے قید سے چھڑایا اور شہر دیدار اور رخسار کے گلزار کے رستے پر ڈال دیا۔ نظر وہاں پہنچ کر حسن سے ملا۔ وہ فراق کی ماری تو انتظار ہی میں بیٹھی تھی، جب نظر کی زبانی سب حال معلوم ہوا تو بہت مایوس ہوئی اور غمزہ کو بلا کر کہا کہ تم اور نظر دونوں جاؤ اور جس طرح بن پڑے، تدبیر سے، حکمت سے، جادو سے ٹونے سے دل کو یہاں لے کر آؤ۔

اب نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو ساتھ لے کر شہر بدن کی طرف سدھارے

کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند سے نکل بھاگا تو عقل کو اسی وقت کھٹکا ہوا تھا کہ یہ جا کر کچھ نہ کچھ فساد برپا کرے گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے اسے ملک سے باہر نہ جانے دیں اور جہاں ملے قید کر لیں۔ زرق کا بیٹا توبہ جو اپنے کوہستان زہد میں رہتا تھا اُسے بھی عقل نے تاکیدی احکام بھیجے تھے۔ جب نظر اور غمزہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو قلعہ کے دیدبان نے اطلاع دی کہ نظر لشکر لئے پہاڑی کے نیچے پڑا ہے۔ توبہ غصے میں بھرا ہوا فوراً لشکر لے کر چڑھ آیا۔ یہ دونوں بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا۔ یہاں سے

چل کر وہ قلندروں کے بھیس میں شہرِ عافیت کی طرف چلے اور وہاں کے بادشاہ ناموس سے ملے۔ اس پر کچھ ایسا جادو چلا کہ تخت و تاج چھوڑ کر وہ بھی فقیر ہو گیا۔

ادھر تو یہ شکست کھا کر با حالِ خستہ و تباہ بادشاہ عقل کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس پر گزری تھی کہہ سنائی۔ بادشاہ نے غمزہ کی یہ سفاکی دیکھی تو دل کو طلب کیا۔ قید سے رہا کیا اور غمزہ کی بیدادی کا قصہ سنایا اور نہایت دلسوزی سے موقع کی اونچ نیچ کو سمجھایا اور کہا کہ حسن کا لشکر بہت سفاک ہے اس میں وفا نہیں۔ تم اگر ان دغا بازوں کی باتوں پر جاؤ گے تو اپنا ملک کھو بیٹھو گے۔ ہماری بات سنو، ہمارا لشکر حاضر ہے اسے لے کر شہر دیدار کے ادھر چلے جاؤ۔ اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں، عورت کی ذات بڑی مکار ہوتی ہے، نہ معلوم اِس عشق کے پردے میں کیا گل کھلاتے۔ دل کو بھی یہ بات پسند آئی اور سمجھا کہ اگر غالب آیا تو حسن اپنی ہے اور جو مغلوب ہوا تو معذوری ہے۔ عقل کی باتوں سے عشق کا ولولہ دھیما پڑ گیا۔

غرض شاہِ عقل کے سپہ سالار صبر کو ساتھ لیا اور لاؤ لشکر لے کر شہر دیدار کا رخ کیا۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ ساتھ والے خبر لائے کہ اس جنگل میں جگہ جگہ ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں گویا ہوا سے باتیں کرتے ہیں۔ دل یہ سنکر بے تاب ہو گیا۔ شکار کا شوق سر پر سوار ہوا۔ تیر کمان لے ہرنوں پر گھوڑا ڈالا۔ وہ اصل میں ہرن نہ تھے وہی غمزے کا لشکر تھا انھیں کون پکڑ سکتا تھا دور نکل جاتے تو ٹھیر جاتے اور جو دل قریب آتا قلانچیں بھر کے آگے نکل جاتے۔ عقل کو خبر ہوئی تو محبت نے جوش مارا اور وہ بھی اُسی طرف راہی ہوا۔ دونوں ہرنوں کے پیچھے سرگرداں چلے۔ اور نظر اور غمزہ انھیں جُل دے کر شہر دیدار کے پاس لے آئے۔ حُسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنی کارگزاری سنائی وہ سنکر باغ باغ ہو گئی۔

اب سوچ یہ پڑی کہ عقل بادشاہ جو لشکر لئے چلا آرہا ہے اس کی کیا تدبیر کی جائے اور اس آفت کو کیونکر ٹالا جائے۔ رائے یہ قرار پائی کہ حسن اپنے باپ کو اطلاع دے کہ وہ کسی جتن سے اس بلا کو ٹالے، چنانچہ اس نے اپنے باپ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میرا ایک وفادار غلام خیال نامی مدت سے غائب تھا اب معلوم ہوا عقل بادشاہ نے گرفتار کر لیا ہے ہم نے طلب کیا تو بہت برہم ہوا اور اب لشکر لئے چڑھا آرہا ہے۔ جب عشق نے یہ مکتوب پڑھا تو مارے طیش کے چہرہ

لال ہوگیا اور کہنے لگا کہ عقل کی یہ مجال کہ وہ اس سرزمین پر قدم رکھے، عقل دیوانہ ہے کہ جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے۔

غرض عشق نے اپنے بہادر سپہ سالار مہر کو مقابلے کے لئے بھیجا۔ عقل یہ فوج دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ فرزندگی نالائقی اور اپنے فعل پر بہت پچھتایا۔ اب لڑائی شروع ہوگئی۔ غمزہ نے عقل پر حملہ کیا، خوب دو دو ہاتھ ہوئے، عقل کو سنبھلنا مشکل ہوگیا، دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر پر قیامت برپا کردی۔ تیسرے دن رات کو زلف نے شبخون مارا، سوتے ہوؤں کو پچھاڑا۔ اتنے میں باس (نسیم) پہنچی اس نے دل کو بہت کچھ ڈھارس دی اور پے در پے حملوں سے غنیم کے لشکر میں کھلبلی مچادی، زلف کو بھگا دیا اور عشق کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔

حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرائی اپنے خال سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کوہ قاف میں تیری ایک ہمزاد ہے بڑی چتر اور دلیر ہے حسن و جمال میں بھی لاجواب ہے۔ وہ آگئی تو بیڑا پار ہے۔ حسن نے کہا وہ کوہ قاف میں، میں یہاں، اس کے آتے آتے تو کام تمام ہو جائے گا۔ خال نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں، میرے پاس عنبر کا دانہ ہے ابھی ابھی آگ پر رکھتا ہوں، چٹکی بجاتے میں تیرے پاس آجائے گی۔ خال نے ایسا ہی کیا اور حسن کی ہمزاد فوراً آپہنچی۔ حسن اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی، گلے ملی اور اپنی ساری بپتا کہہ سنائی، ہمزاد نے کچھ سوچ بچار کے بعد کہا دوست، عقل کیا چیز ہے، وہ ہمارے حملے کی کیا تاب لاسکتا ہے۔ حسن کی ہمزاد نے اپنا ناز، غمزہ، شیوہ، نخرہ سپہ سالار مہر کی مدد کو بھیجا۔ حسن کے پاس ایک باکمال تیرانداز بھی تھا، جس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا، اس کا نام ہلال تھا، اسے بھی حسن نے سپہ سالار کی کمک پر بھیجا۔ جب یہ پہنچے تو سپہ سالار کا پلہ بہت بھاری ہوگیا۔ ہلال عقل کے لشکر پر جا پڑا، صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا اندر گھستا ہوا چلا گیا اور ایک بارگی دل کے پاس جا پہنچا اور انجان پنے سے ایسا تیر جوڑ کر مارا کہ دل گھوڑے پر سے زمین پر آگرا۔ مارنا کسے چاہتا تھا اور لگ گیا کسے، قضا پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ عقل نے جو یہ دیکھا تو حواس جاتے رہے، سارا لشکر تو کہیں، میں کہیں، فرار ہوگیا۔ عقل بے چارہ مارا مارا پھرا کہیں

ٹھکانا نہ ملا۔

ادھر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ حُسن ہزار ہزار شکر بجالائی۔ عقل کو پاش دیکھ کر حسن کے خدمت گاروں نے دل کو گرفتار کر لیا اور حسن کے پاس لے آئے حسن کی نظر جو اس پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل سے آہ نکلی، بے تاب ہو گئی۔ مارنے والے کو کوسنے دینے لگی اور خدمت گاروں پر آفت برپا کر دی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، خاموش ہو رہی مگر دل کو لگی ہوئی تھی، اپنی دائی ناز کو بلایا اپنی بے قراری اور بے تابی کا حال سُنایا دائی نے کہا جلدی اچھی نہیں مصلحت سے کام لینا چاہئے ورنہ اس میں بڑی بدنامی ہو گی مناسب یہ ہے کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے جسے چاہ ذقن کہتے ہیں، کچے سونے کا بنا ہوا ہے اور اس کا سواد بھی اچھا ہے فی الحال دل کو وہاں بند رکھا جائے۔ دل بیچارہ یہاں گرفتار، اُدھر حُسن بے قرار۔

آخر حسن سے نہ رہا گیا اس نے اپنی سہیلی وفا کو جو سپہ سالار مہر کی بیٹی تھی، بلا کر اپنے دُکھ کی داستان بیان کی اور کہا کہ دل سے ملنے کی کوئی تدبیر کرو۔ وفا نے کہا میرے خیال میں ایک بات آتی ہے کہ شہر میں ایک باغ ہے (جس کا نام باغ آشنائی ہے[1]) اس میں ایک چشمہ ہے جیسا چشمۂ آبِ حیات۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک چھجا ہے جس پر غمزے کے بادل چھائے رہتے ہیں اور ناز کے موتی برستے ہیں۔ اس چھجے میں دو کالی کالی کھڑکیاں ہیں جوان کھڑکیوں کو کھول کے داخل ہو تو وصال کی لذت پائے۔ حسن نے منت سے کہا اگر تو یہ کر سکتی ہے تو للہ جلدی کر اور ساتھ ہی زلف کو حکم دیا کہ دل کے پیچ سب کھول دے اور چاہ ذقن سے باہر نکال لا۔ زلف ناز و ادا سے اَکڑتی لچکتی گئی اور دل کو چاہ ذقن سے باہر نکال لائی۔ راستے میں وفا بھی آ پہنچی دل سے گھل مل کے باتیں کرنے لگی، بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا حُسن نے جو تجھے بند کر رکھا تھا رکھا تھا اس میں مجبوری تھی، باپ کا ڈر اور لحاظ تھا اگر ایسا نہ کرتی تو تیری جان کے لالے پڑ جاتے۔ حُسن نے تیرے ساتھ بڑی مروت اور

---

[1] یہ نام دستور عشاق میں ہے سب رس میں اس کا کوئی نام نہیں دیا۔

عنایت کی ہے تجھے اس کی قدر کرنی چاہئے، غرض اس طرح کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے دل کو لبھایا اور محبت کی گرمائی سے گرمایا۔ کنویں سے نکل کر باغ میں جو آیا تو بہت خوش ہوا۔ بہت دنوں کا تھکا ماندہ تھا وہیں پھولوں کی کیاری پر پڑ کے سو رہا حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، ہوا کی طرح اڑ کے آئی، دیکھا کہ دل کا قرار جی کا آرام دل پڑا سو رہا ہے اور سارا باغ اس کے حُسن کی جوت سے جگمگ کر رہا ہے دل کی صورت دیکھ کر حسن کا دل ہاتھ سے جاتا رہا اس کے پاؤں پر آنکھیں ملیں، بلائیں لینے لگی اور اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ چند قطرے دل کے رخسار پر جو گرے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ باغ میں دفعتاً یہ نئی بہار کہاں سے آگئی سارا چمن نور کا عالم ہے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو دوسرا ہی عالم نظر آیا۔ دل سے آہ نکلی، بیقرار ہو گیا اور محبت کے جوش میں دوڑ کر قدموں پر گر پڑا۔ اب گلے شکوے اور راز کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد حسن نے کہا کہ تیرے عشق نے بیتاب کر دیا اور یہاں کھینچ لایا اب اجازت دے جاتی ہوں اور وصال کی تدبیر کرتی ہوں برا نہ مان اور میری مصلحت کو پہچان۔ [1]

سر شام وفا اور ناز نے پچھے پر مجلس عشق آراستہ کی، نظر اور خیال اور تبسم چشمے پر صحبت رکھتے تھے۔ حسن نے وفا کو بلا کر کہا کہ خیال، نظر اور تبسم سے کہو کہ دل کو دارو دے بیہوش، بلائیں اور زلف سے کہو کہ دل کو اس پچھے پر اس طرح لیکر آئے کہ کسی اور کو تو کیا اُسے بھی خبر نہ ہو۔ خیال، نظر اور تبسم نے حکم کی تعمیل کی اور زلف اُسے پچھے پر اس طرح اُٹھا لائی کہ دل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ غرض اس طرح روز حُسن دل کو بالاخانے پر لاتی، مزے اُڑاتی اور دل کے ارمان نکالتی۔

آخر یہ چوری کب تک چھپتی۔ رقیب کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا حُسن کے پاس رہتی تھی۔ ظاہر میں دوست پر دل میں کھوٹ تھا۔ اُسے اس کا جلاپا تھا کہ حُسن اکیلے اکیلے

---

[1] اس بیان میں اور لبعد کے بعض حالات میں دستور عشاق سے خفیف سا اختلاف ہے۔

کہیں جاتی ہے اور مجھ سے چھپاتی ہے اس کی ٹوہ میں رہنے لگی، ایک روز چپکے سے حسن کے پیچھے ہولی اور بالاخانے پر ایک کونے میں چھپ کے بیٹھ رہی اور سارے راز سے واقف ہو گئی۔

ایک شب ایسا ہوا کہ حسن شہر گئی تو کسی وجہ سے اس کا آنا نہ ہوا، غیر موقع پا کر وصال کے بالاخانے پر چڑھ گئی۔ جادو ٹونے میں کمال رکھتی تھی، حسن کا بھیس بدل کر بیٹھ گئی۔ جس طرح حسن حکم دیتی تھی اسی طرح اس نے بھی حکم دیا۔ داروئے بیہوشی پلا زلف اسے جوں توں بالاخانے پر لائی۔ اتنے میں خیال جو سو رہا تھا جاگا، دل کو دیکھا تو کہیں نہ پایا۔ بہت پریشان ہوا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وصال کے بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا کہ غیر دل کی گود میں مست پڑی ہے اور دل بے خبری کے عالم میں ہے۔ فوراً شہر دیدار کو دوڑا گیا اور جو کچھ دیکھا حسن سے من وعن بیان کیا۔ یہ سن کر حسن کے ہوش جاتے رہے، تن بدن میں آگ لگ گئی، جیسے بیٹھی تھی اٹھ کھڑی ہوئی اور حسد کی آگ میں جلتی وصال کے بالاخانے پر آئی۔ غیر اور دل کو ایک جگہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ کوسنے اور گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا اور ایک قیامت برپا کر دی۔ غیر ہکا بکا رہ گئی اور چھپ کر دوسرے رستے سے نکل بھاگی۔ حسن دل پر بھی سخت برافروختہ ہوئی اور اس کی بے وفائی اور بے خبری سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور طیش میں آ کر خیال، نظر اور تبسم کو حکم دیا کہ اس نالائق بے وفا مورکھ کو باغ سے باہر نکال دو۔

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یہ فریب کیا، اُدھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی اور حسن اور دل کے کرتوتوں کی ساری کیفیت سنائی۔ وہ سن کر بہت برافروختہ ہوا، شہر دیدار میں آیا دل کو بندی خانے سے نکال شہر سنگسار میں لے گیا۔ وہاں ہجر نام کا ایک کوٹ تھا اسی میں قید کر دیا۔ دل بیچارہ سخت پریشان اور جینے سے بیزار تھا۔ تمام حالات سے بے خبر، جی ہی جی میں یہ کہتا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی کہ حسن نے یہ ستم مجھ پر ڈھایا ہے۔

نہ معلوم غیر کے دل میں کیا آئی شاید دل کے حال پر ترس آیا کہ اس نے حسن کو ایک خط

لکھا اور اصل واقعہ کہہ سنایا کہ دل غریب بے گناہ ہے اصل قصور میرا ہے ہیں تیری صورت بنا کر اس سے ملی، اسے کیا خبر تھی کہ یہ دغا بازی ہے ۔ بے خبر مست پر پاداش لازم نہیں، وہ عاشق صادق ہے اس پر غصہ درست نہیں۔ اس رقعہ کا مضمون پڑھ کر حسن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، ہوش وحواس جاتے رہے، بال نوچنے لگی، سینہ کوٹنے لگی اور اپنے کئے پر بہت نادم ہوئی۔ اسی وقت دل کو اشتیاق بھرا خط لکھا جس میں اپنے فراق اور غیر کی شکایت لکھی اور ہزاروں قسمیں دیکر اپنی بے گناہی کا ثبوت دلایا۔ خیال کے ہاتھ یہ رقعہ دل کو بھیجا۔ جب یہ نامۂ شوق دل کو پہنچا تو وہ بھی بے تاب ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے جواب میں لکھا کہ تیرا اس میں کوئی قصور نہیں یہ سارا فساد غیر کا ہے میرا دل تجھ سے صاف ہے، وہی محبت وہی چاہ ہے ۔ تو اگر مجھے داروئے بیہوشی نہ پلایا کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا، خیر جو ہوا سو ہوا۔

اب دوسری طرف کا حال سنئے۔ عقل بادشاہ شکست کھا کر شہر بدن میں آیا اور مارے شرم کے کہیں چھپ رہا۔ اور صبر جو عقل کا سرلشکر تھا وہ بھاگ کر شہر ہدایت میں آیا اور ہمت کو اپنی بدبختی اور مصیبت کی ساری داستان سنائی۔ ہمت نے بہت رنج و افسوس کیا اور کہا کہ عقل کا مجھ پر بہت حق ہے، شرط دوست داری یہ ہے کہ اب عقل اور دل کی خبر لوں نہ معلوم ان بدنصیبوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ کہہ کر تلوار ہاتھ میں لی اور اپنا لشکر ساتھ لے کر شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا۔ رستے میں جہاں جہاں پہنچتا عقل و دل کا حال پوچھتا جاتا۔ چلتے چلتے قامت کے بوستان میں آیا۔ قامت نے کہا اے ہمت تو نے خوب کیا، تجھ پر ہزار رحمت۔ سچے اور وفادار آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب اس نے بیان کیا کہ دل ایک سال ہوتا ہے ہجراں کے کوٹ میں بند ہے۔ عقل شہر بدن میں پڑا ہے عشق سے جیتنا مشکل ہے۔ اس سے مل کے رہنے ہی میں مصلحت ہے۔ اب صرف ایک تدبیر ہے کہ عشق کو سمجھا بجھا کر کسی طرح منایا جائے۔ عشق بہت بڑا بادشاہ ہے اگر اس سے التجا کی گئی تو ضرور مان جائے گا۔ اس سے صلح کئے بغیر گزر نہیں۔ ہمت کو یہ مشورہ بہت پسند آیا[1] اور اسی وقت اپنا لاؤ لشکر چھوڑ عشق کی خدمت میں پہنچا اس کی طرح

---

[1] دستورِ عشاق میں یہ قامت کا مشورہ نہیں بلکہ ہمت کی اپنی رائے ہے۔

ستائش کی۔عشق نے بھی اس کا احترام کیا اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ ہمّت بندہائی موقع دیکھ کر عقل اور دل کا ذکر چھیڑا اور اُن کی طرف سے ایسی وکالت کی کہ عشق راضی ہو گیا اور یہ قرار پایا کہ عقل، عشق بادشاہ کی وزارت قبول کرے، عشق کے بعد سب سے بڑا رتبہ اسی کا ہوگا۔عشق بادشاہ اور عقل وزیر ہوا تو کام خاطر خواہ چلے گا۔

اس کے بعد عشق نے اپنے سرلشکر مہر کو حکم دیا کہ شہر بدن جا کر عقل کو تسلی اور دلاسا دے اور عزت وحرمت کے ساتھ یہاں لائے۔مہر جس قدر جلد ہو سکا شہر بدن پہنچا اور عقل سے ملاقات کی۔عشق نے جو کہا تھا حرف بحرف بیان کیا اور سب کچھ اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ کسی طرح کی فکر نہ کر تیرے اقبال نے زور کیا ہے وہاں جانے کے بعد سب خرخشے دور ہو جائیں گے اور تو امن وآسائش اور بلند اقبالی کے ساتھ رہے گا۔عقل نے یہ سمجھ کر کہ اب حکومت و دولت جا چکی ہے، یار دوست مشیر اور مصاحب سب نے منہ موڑ لیا ہے، مصلحت یہی ہے کہ عشق کی بات مان لی جائے۔غرض اس نے عشق کا فرمان قبول کیا اور مہر کے ساتھ عشق کے حضور پہنچا عشق بھی اس سے بڑے احترام اور عزت کے ساتھ پیش آیا۔گلے سے لگایا اور ہر طرح خاطر جمع کی اور کہا کہ میں بادشاہ تو وزیر، ملک اور حکومت تیرے سپرد ہے، مجھے ملک داری سے کیا فائدہ، جو تو مناسب سمجھے کر۔

غرض جب عقل عشق بادشاہ کا وزیر ہو گیا تو عشق نے ہمّت سے کہا کہ دل کو ہجراں کے کوٹ سے چھڑا کر میرے سامنے حاضر کر اور اس کے پاؤں کی بیڑیاں نکال کر رقیب کے پاؤں میں ڈال اور غیر کو جو اس کی بیٹی ہے ایسی جگہ قید کر کہ وہاں سے نکل نہ سکے ہمت سلام کر کے روانہ ہوا اور دل کو ہجراں کے کوٹ سے لڑ جھگڑ کر باہر لایا اس کی بیڑیاں رقیب کے پاؤں میں ڈالیں اور غیر کو بھی ایک مکان میں بند کر دیا۔اگرچہ اس پر اس کا دل دکھا لیکن حکم کی تعمیل واجب تھی۔غیر نے جیسا کیا تھا ویسا پایا۔اس کے بعد ہمت دل کو

---

۱ دستور عشاق کی روایت ہے عقل لڑائی میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور قید میں تھا اس میں مہر کو حکم دیا گیا کہ اسے قید سے نکال کر شہر بدن میں لے جائے اور پھر ہمارے پاس لائے۔

عشق کے پاس لایا اور عشق کو دل سے ملایا۔ سب ایک دوسرے کے گلے ملے۔ آخر عقل اور عشق نے باہم مشورہ کر کے یہ ٹھہرایا کہ حسن کا دل سے عقد کر دیا جائے۔ القصہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دونوں کی مراد بر آئی۔ گھر گھر عیش و عشرت کا سماں تھا اور خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔

ایک روز دل اور ہمت اور نظر تینوں شراب پئے رخسار کے گلزار میں پہنچے۔ وہاں آب حیات کا چشمہ دہن دیکھا وہاں ایک پیر سبز پوش یعنی خضر نظر آئے۔ ہمت نے دل سے کہا کہ اس پیر روشن ضمیر کی قدم بوسی کر اور اس بزرگ کی دعا لے۔ دل دوڑ کر قدم بوس ہوا ادب سے نزدیک بیٹھا خضر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب راز کھول دیا اور دل خضر کے فیض سے اپنے دل کی مراد کو پہنچا۔ حسن اور دل رہنے سہنے، پھولے پھلے، بال بچوں والے ہوئے۔ ان کا سب سے بڑا فرزند یہ کتاب ہے جو اپنے وقت کا افلاطون و لقمان ہے، روشن ضمیر، صاحب تدبیر ہے جو کوئی صاحب نظر ہوگا اسے یہ سخن پہچانے گا اور قدر کرے گا۔

یہ ہے سارے قصہ کا لب لباب۔ عقل و عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے یہ مہابھارت اور جرمن جنگ سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ یہ عالمگیر جنگ ہے جو ہر آن ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا اور اگر صرف جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنوں ہو جاتا کاش وہ کچھ ہوتا ایک ہوتا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں۔ عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں۔ عقل اسے بے راہ روی سے ٹوکتی اور اعتدال کی حد میں رکھنا چاہتی ہے، عشق جو ہر حد سے آزاد ہے اور جس کے ہاں اعتدال ایک بے معنی لفظ ہے۔ اسے اس تنگنائے سے نکال کر محبت و جنون کی وسیع اقلیم میں لے جانا چاہتا ہے۔ عقل اسے دنیا داری سکھاتی اور دنیا میں سلیقے اور ہوشمندی سے رہنا بتاتی ہے، عشق دنیا و دنیا داری کو ٹھکراتا ہے اور اسے ایک ایسے عالم میں پہنچانا چاہتا ہے جہاں نہ تن بدن کی خبر ہے نہ ہوش و حواس کی۔ جہاں نہ اپنے کی فکر ہے نہ پرائے کی۔

انسان اس دوراہے میں آکر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور ایک عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے بعض اوقات اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ان دونوں کی ضد میں یہ بیچارہ مفت میں پس جاتا ہے۔ جب توفیق یاوری کرتی ہے تو ایسے نازک وقت پر ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا شروع کرتی ہے۔ عشق پر معمولی پند و نصایح کا اثر کیا ہو سکتا ہے اس لئے وہ اسے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایسا لبھاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صلح میں راہِ مستقیم ہے۔ اسی رستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی انسانِ کامل نظر آجاتے ہیں۔

فتاحی نے اس رزمیہ مثنوی کو بڑی خوبی سے لکھا ہے۔ زبان شستہ، بیان بہت پاک صاف، خیالات اعلیٰ، اشعار میں چستی اور روانی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ صنایع بدایع کا دلدادہ ہے جیسا کہ اسکی دوسری تصانیف سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس مثنوی میں وہ کہیں اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھتا، سوائے اِن دو رقعوں کے جو حُسن نے دل کو اور دل نے حسن کو لکھے ہیں۔ ان میں البتہ اس نے پوری کسر نکال لی ہے اور سارے صنایع بدایع ختم کر دیئے ہیں۔ رزم کے علاوہ جہاں کہیں بزم کا موقع آیا ہے تو اسے بھی ویسی ہی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ تو مثنوی کی ظاہری خوبیاں ہیں لیکن وہ باطنی خوبیوں سے بھی مالامال ہے اس نے عقل و عشق اور حسن کے اعوان و انصار، اُن کے شہروں کے نام، ان کے سرلشکر اور مصاحبوں وغیرہ کے نام تجویز کرنے میں بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ مثلاً عقل کا بیٹا دل، عشق کی بیٹی حُسن، عقل کا شہر بدن اور عشق یا حسن کا شہر دیدار۔ عقل کا سپہ سالار صبر او اور عشق کا مہر۔ عقل کا وزیر وہم۔ دل کے ساتھی نظر، ناموس، توبہ وغیرہ، حسن کے ساتھی ناز غمزہ، عشوہ، زلف، خیال وغیرہ۔ اِس طرح قصر وصال اور قلعۂ ہجران وغیرہ یہ سب نام بڑی مناسبت کے ساتھ تجویز کئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسا موقع اور محل ہے اُسی کی مناسبت سے ساری گفتگو اور تمام مصلحتیں عمل میں آئی ہیں اور اس معاملے میں وہ بہت کم غلطی کرتا ہے فتاحی شاعر ہی نہیں حکیم بھی ہے۔ جہاں جہاں اِس نے موقع سے بعض حکیمانہ باتیں لکھی ہیں وہ بڑی خوبی سے ادا کی ہیں اور وجہی کی طرح بے جا طوالت نہیں دی ہے۔ تعجب ہے

کہ اگرچہ اس مثنوی کی تقلید ترکی اور ہندوستان و دکن میں کی گئی لیکن یہ مشہور نہ ہونے پائی۔ حالانکہ یہ اپنے لطفِ بیان اور خوبیِ مضمون کے لحاظ سے بڑے پایہ کی مثنوی ہے۔

وجہی نے اگرچہ پورا قصہ فتاحی سے لیا ہے لیکن جہاں کہیں قصہ کی واردات میں اختلاف کیا ہے وہیں اس سے غلطی ہوئی ہے۔ بعض خاص اختلافات کا تو میں ذکر کر چکا ہوں لیکن دو ایک اور اختلافات بھی ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو قصے کی پہلی سطر اور پہلے جملے میں ہے۔ وجہی قصہ یوں شروع کرتا ہے۔" ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان" دستورِ عشاق میں سیستان کی جگہ یونان ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی مملکت کے لئے یونان سے زیادہ اور کون سا ملک ہو سکتا ہے۔

نظر جب حسن کی بارگاہ میں پہنچتا ہے تو فتاحی نے اس موقع پر ان دونوں کا بہت ہی دلچسپ اور پر لطف مکالمہ لکھا ہے۔ حسن نظر کی اہلیت اور لیاقت دیکھنے کے لئے مختلف قسم کے سوال کرتی ہے، اور نظر اُسے جواب دیتا ہے۔ سوال و جواب دونوں برجستہ اور مختصر ہیں اور بڑے اچھے انداز میں بیان کئے ہیں۔ سب رس میں یہ پُرلطف چیز نہیں ہے۔

نظر اور غمزہ جب توبہ کو شکست دے کر شہرِ عافیت میں قلندروں کا بھیس بدل کر ناموس کے ہاں پہنچتے ہیں تو وجہی لکھتا ہے کہ" ناموس بادشاہ انوکوں دیکھتیچ مال ملک سب چھوڑیا، کچھ نہ لوڑیا، قلندر ہوا، سمندر ہوا، فقیر ہوا، بے تدبیر ہوا" یہ بات بالکل خلافِ قیاس ہے کہ دو قلندروں کو دیکھتے ہی ناموس بادشاہ فوراً قلندر ہو جائے۔ فتاحی سے ایسی چوک نہیں ہوئی۔ غمزہ ناموس کی خدمت میں پہنچکر معارف و حقائق کی ایسی پر اثر باتیں کرتا ہے کہ ناموس کا دل دنیا کے مال و دولت سے اُچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ تاج و تخت چھوڑ کر قلندر بن جاتا ہے اس سے ایک اور ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ وجہی نے دستورِ عشاق نہیں دیکھی تھی اس کی نظر سے صرف نثر کا خلاصہ گزرا ہے۔

ایک دوسرا اختلاف وہاں پایا جاتا ہے جب ہمت عقل کی خیر خواہی اور دلسوزی میں دیارِ عشق کو جاتا ہے اور بادشاہ سے ملتا ہے۔ وجہی نے اس ملاقات کا جو ذکر کیا ہے اس میں نہ کوئی بات خلافِ قیاس ہے اور نہ بے موقع۔ حسبِ معمول ملاقات ہوتی ہے تو موقع

پاکر ہمت عقل اور دل کا ذکر چھیڑتا ہے اور اس ڈھنگ سے عشق کو سمجھاتا ہے کہ وہ راضی ہو جاتا ہے اور بس۔ لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ کیا کہتا ہے اور وہ کیا جواب دیتا ہے اور آخر کن باتوں سے اُسے رام کرتا ہے۔ کیونکہ جو شخص اتنی اہم سفارت پہ جا رہا ہے اِس سے ضرور یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ ایسے نازک موقع پر اپنی لسانی اور حکمت عملی کے جوہر دکھائے گا۔ فتاحی زیادہ موقع شناش اور آداب داں ہے۔ وہ اس سارے واقعہ کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے کہ جب وہ عشق کے شہر میں پہنچتا ہے اور عشق کو اطلاع ہوتی ہے تو وہ اسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں وہ دربار کی شان و شوکت بیان کرتا ہے۔ عشق نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ آدمی قابل اور معزز ہے، اُسے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے اور سفر کی کیفیت پوچھتا اور مزاج پُرسی کرتا ہے (وجہی کی طرح نہیں کہ دربار میں پہنچا تو جھٹ بادشاہ نے ہمت کو گلے لگا لیا) اس کے بعد ایک قصر بلند میں ٹھیرانے کا حکم دیا اور مہر کو مہمانداری کے لئے مقرر کیا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ اسے بزم خاص میں بلاتا ہے۔ ہمت خلوت میں پہنچنے کے بعد عشق کی مدح و ثنا کرتا ہے اور اس کی بزرگی و فضیلت اور اس کے سطوت و شان کا بیان کرتا ہے اور آخر میں دبی زبان سے یہ کہتا ہے کہ خلفِ باغ خلافت کا نخل ہے اور وہ نہیں ہے۔ اگرچہ بادشاہ کے گنجینہ میں ایک ایسا گوہر ہے (یعنی بیٹی) جو سزاوار تاج ہے۔ تاہم اس کے لئے بر کی ضرورت ہے اور یہ پیوند اس کی شان کے شایاں ہونا چاہئے۔ کیونکہ میوہ اصل میں ہزار شیریں ہو پیوند سے وہ شیریں تر ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس نے بادشاہ کے دل کی کہی اور اس حسن و خوبی سے کہی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھنے لگا کہ تم بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہو، تم ہی بتاؤ کہ ایسا بر کہاں مل سکتا ہے، اب اسے دل اور عقل کا واقعہ بیان کرنے کا موقع مل گیا غرض سوال و جواب کے بعد عشق یہ کہتا ہے کہ ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ عقل بادشاہ ہے اور اس کا ملک آباد اور لشکر توانا ہے لیکن میں اس کے نسب اصل سے واقف نہیں اور جب تک یہ معلوم نہ ہو اس کے ہاں رشتہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے جواب میں ہمت کہتا ہے تاریخ ایسا آیا ہے کہ پہلے جس نے اس عالم کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک فتح کیا وہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا جس کا نام فرد تھا اور دنیا میں اس کے عدل و انصاف کی بڑی شہرت

تھی۔ ایک کو تو اس نے مشرق کی حکومت دی اور دوسرے کو مغرب کی اور خود دنیا چھوڑ کر کوہِ قاف کے غاروں میں چلا گیا۔ ان دو کی نسل چلی اور ایک مدت کے بعد اس کی نسل سے دو اور شہزادے ہوئے اور ان میں سے ایک کی نسل عقل اور دوسرے کی نسل عشق بادشاہ۔ یہ سن کر عشق بادشاہ اچھل پڑا اور کہنے لگا او ہو، ہم اور وہ ہم جد ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ اب ہم پھر مل جائیں۔ پھر کیا تھا عقل اور دل قید سے رہا ہوئے عزت و احترام سے لائے گئے اور اپنی اپنی مراد کو پہنچے۔

بعض بہت خفیف سے اختلافات اور بھی ہیں لیکن وہ قابلِ ذکر نہیں۔ لیکن جن چند اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے فتاحی کی ذہانت اور طباعی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وجہی کو اگر یہ اصل کتاب مل جاتی تو یقین ہے کہ وہ ضرور ان تمام امور کو اسی نہج سے بیان کرتا۔

ایک بات البتہ بڑے مزے اور حیرت کی یہ ہے کہ وجہی نے کتاب کی ابتدا میں بڑے بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ڈھنگ اسی کا ایجاد کیا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیاں ہوں، دریا ہو کر موتیاں رولیاں ہوں، موتیاں کے موجاں کا میں دریا ہوں، تمام موتیاں سوں بھریا ہوں ...... یو کتاب عجائب بند ہے اگر سو بیج منگتا و گر جنیدر ہے۔ فرہاد ہو کر دونوں جہاں لے آزاد ہو کر، دانش کے تیشے سوں پہاڑاں الٹا یا تو یہ شیریں پایا، تو نوی بات پیدا ہوئی تو اس باٹ آیا۔"

نادانان اپنی باتاں میں یو بی ایک باٹ کر جانے، ولے یو بات کیوں کاڑی۔ کس وضع سوں نکلی محنت نیں سمجھے مشقت نیں پہچانے۔ انوکوں نیں کتے زباں آور، یو بولتے جناور ..... دانا ہمنا رہنما کرے گا ہادی ہے کر پہچانے گا۔ یہ باٹ نہ تھی سو نکلی اتال، تو بھی یکایک چلنی محال۔"

آگے چل کر لکھتا ہے کہ "یہ بات نہیں یو تمام وحی ہے الہام ہے"..... اس کے بعد اور ایک جگہ لکھتا ہے۔ "جکوئی اچایا جنیاو، اول و آخر ہی استاد"

غرض اس دعوے کو وہ بار بار طرح طرح سے جتاتا ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ قصہ کا یہ نیا ڈھنگ اس کا نکالا ہوا ہے تو یہ صریح غلط ہے — لیکن اگر اس سے یہ مراد ہے

کہ تحریر کا یہ اسلوب اُردو زبان میں اس کا ایجاد ہے تو بے شک صحیح ہے۔ لیکن اس سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ وہ بار بار یہ بھی کہتا ہے جو اسے موجد اور ہنما اور استاد نہیں مانتا وہ جاہل، کمینہ اور چور ہے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ "جکوئی بات ہماری چلیا وہ ہمارا چ ہے۔ ہر چند فہمداری ہے، چلیا تو کیا ہوا، بات ہماری ہے اگر نکتہ کسی نے کچھ جانیا، ہم ظاہر ہم باطن اسے نیں مانیا، تو وو مسلمان نیں۔ اُسے ایمان نیں۔ ایسے سے ڈرنا، بہوت بہوت پرہیز کرنا۔ یو بی ایک چوری ہے، یو بی ایک حرام خوری ہے۔ نمک بر حرام، اس کا کیا اچھے گا فام۔ جیسے انصاف کی نیں سکت، اُسے دل کا دیچ میں انپڑے لت۔ جنے انصاف چھپایا، اُنے دل کو بے دل کیا کام گنوایا۔"

اس لے میں وہ بہت دُور تک کہتا چلا گیا ہے اور اس کا کہنا بالکل درست ہے جو کوئی کسی خیال، کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد ہے اس کا احسان ماننا ضرور ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے اس کا اعتراف کرنا لازم ہے۔ لیکن وجہی کے منہ سے یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس نے سارا قصہ شروع سے آخر تک فتاحی سے لیا اور کہیں اس کا اقرار . . . . نہیں کیا اور یہی نہیں بلکہ تحریر کا اسلوب بھی اُسی سے اُڑایا ہے۔ یہ مانا کہ وہ فارسی میں ہے اور یہ دکنی میں۔ ایسی حالت میں وہ اخلاقی فرض اور انصاف جس کی تلقین وجہی نے اس طمطراق سے کی ہے کہاں باقی رہا۔ وہ کس منہ سے یہ توقع کر سکتا ہے کہ آئندہ اس رستے پر چلنے والے اُسے موجد مانیں گے۔ اس کی تقلید کرنے والے اسے استاد سمجھیں گے۔ یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت۔

باوجود اس کے ہم وجہی کو استاد مانتے ہیں اور جو کام اس نے کیا ہے اس کا احسان نہ ماننا حقیقت میں ناانصافی ہے۔ اُس زمانے میں اُردو نثر کا نام نہ تھا اور نہ نثر لکھنا کوئی کمال کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ایک دو رسالے جو اس کے قبل کے پائے جاتے ہیں سو وہ اس قابل نہیں کہ محفل ادب میں جگہ پائیں۔ "سب رس" اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے اور اس کی فضیلت اور تقدم کو ماننا پڑتا ہے نثر میں قافیہ کا التزام بذات خود ایک ایسی چیز ہے کہ تکلف اور آورد سے بچنا محال ہے اور

اس میں شبہ نہیں کہ اس پابندی کی وجہ سے بعض بعض مقامات پر عبارت محض تک بندی ہو کے رہ گئی ہے اور ادائے مطلب میں بھونڈاپن نظر آتا ہے اور جو کوئی بھی اس قسم کی پابندی اپنے اوپر عائد کرے گا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس میں بے حد فصاحت روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ حال کے زمانے میں جو اسی ڈھنگ پر بعض کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً فسانۂ عجائب وغیرہ اُن سے یہ کسی طرح کم نہیں بلکہ میری رائے میں بیان کی سادگی میں اُن سے بڑھ کر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسکی زبان قدیم ہے اور پُرانے الفاظ اور محاورات آج کل سمجھ میں نہیں آتے لیکن اس میں نہ مصنف کا قصور ہے اور نہ اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی حرف آسکتا ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی نہایت بامحاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی کہتا ہے اور اس سے ہمیں کامل اتفاق ہے

"آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر نہیں بولیا۔"

دیکھیے کہ وہ اپنی زبان کو دکنی نہیں ہندی کہتا ہے قصے کے شروع میں بھی "وہ آغاز داستان زبان ہندوستان" لکھتا ہے۔ جگہ جگہ نہایت بے تکلفی سے ہندی، دکھنی، فارسی، عربی، مرہٹی ضرب الامثال، دوہرے اور اقوال، اشعار، آیت، حدیث روانی میں لکھتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ وجہی گولکنڈہ کا ہے اور گولکنڈہ اور حیدرآباد تلنگانے میں ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ مرہٹی مثل تو ایک جگہ لکھتا ہے اور ایک آدھ گجراتی لفظ اور شعر بھی استعمال کرتا ہے۔ مگر کہیں تلنگی مثل یا فقرہ یا لفظ (سوائے درادرائی کے جس کے متعلق ابھی مجھے شبہ ہے) اس کتاب میں نہیں آیا۔ اہل ہند سے مراد مصنف کی ہمیشہ شمالی ہند والے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے "بقول اہل ہند پیاسا کیا منگتا پانی" اسی طرح جب اپنے دکن کی مثل یا قول کی طرف اشارہ کرتا ہے تو لکھتا ہے "جوں دکھن میں چلیا ہے" (صفحہ ۱۳۶) یعنی جیسا کہ دکن میں مشہور ہے۔ یا "مثلاً ہے دکن میں" (صفحہ ۱۵۶) یا دکنی دوہرا (صفحہ ۲۲۶) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف شمالی ہند اور دکن کی زبان میں فرق کرتا ہے اور یہ پہلا شخص ہے جو اس زبان کو زبان ہندستان کہتا ہے اور یہ اشارہ کافی ہے اس امر کے لئے

کہ یہ زبان کہاں سے آئی۔ یہی کتابیں ہیں جو زبان کے محقق اور مورخ کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہیں۔

اس کے بیان میں ایک نقص ضرور ہے کہ ملا صاحب نے جگہ جگہ پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے اور کہیں کہیں تصوف کے اسرار جواب معمولی باتیں ہو گئی ہیں بیان کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دس پانچ سطریں لکھ دیں بلکہ صفحے کے صفحے رنگ دئے ہیں۔ باتیں معقول ہیں، صاف ستھری ہیں، نصیحتیں کام کی ہیں، بیان اچھا ہے لیکن قصے میں جب وعظ شروع کر دیا جائے تو قصے کا لطف کم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے۔ مثلاً قصے کی پہلی سطر یہ کہ "ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان، اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل" بس عقل کا نام آنا تھا کہ غضب ہو گیا، کئی صفحے رنگ ڈالے ہیں، عقل کے کارنامے اس کے فیوض و برکات اور نہ معلوم کیا کیا بیان کر ڈالا ہے۔ شہزادہ دل کی شراب نوشی کا ذکر آیا تو شراب کی تعریف اور بادشاہوں کے لئے مکر و ریا کے مقابلے میں اس کے جواز پر بحث شروع کر دی ہے۔ عشق کے مقام پر عشق پر گفتگو چھیڑ دی ہے، کہیں حیا کی مدح اور سوال کرنے کی مذمت میں، کسی جگہ آب حیات کی خاصیت اور تعریف میں، کہیں طمع کی برائی میں، کسی مقام پر ہمت کی تعریف میں، کسی جگہ عشق، عاشق اور معشوق پر طویل بحثیں شروع کر دی ہیں۔ اسی طرح مصیبت، فقر اور صبر، خواب، لڑائی، بہادری، مشیروں اور مصاحبوں کے انتخاب، عورت کی محبت، سوکن کے جلاپے، عشق کی قسموں اور بادشاہت کے فرائض وغیرہ پر اپنے خیالات بے تکلف لکھتا چلا گیا ہے۔ اگر ان تمام غیر متعلق مباحث کو نکال لیا جائے تو مضامین وجہی کی ایک اچھی خاصی دوسری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ فتاحی کہیں اس قسم کی بے اعتدالی نہیں کرتا۔ اس نے قصے کے تناسب کو بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے۔ میرا قیاس کہ "سب رس" اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی اور اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہی پند و موعظت تھی جو عام لوگوں کو بہت پسند آئی اور چونکہ عبارت اس کی مقفیٰ اور سلیس تھی اس لئے عام و خاص سب اسے شوق سے پڑھتے ہوں گے اُس وقت لوگوں کو یہ طول بیانی اس وجہ سے پسند تھی اور اب ہمیں یوں پسند ہے کہ اس میں قدیم

زبان کے محقق کے لئے بہت سا سامان موجود ہے۔

اس طول بیانی میں جو اکثر پرانے زندہ دل لوگوں اور قصہ گویوں اور قصہ نویسوں کی عادت تھی ایک اور فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں بعض اوقات ضمنی طور پر زمانے کی معاشرت کے متعلق بہت سی کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی کتاب میں جہاں مصنف عقل، دل یا عشق اور حسن کے معاملات ان کے دربار اور تفکرات کا ذکر کرتا ہے تو ایشیائی حکومت کا ڈھنگ، ان کی حکمت عملی، اس زمانے کی تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اطوار و آداب کا منظر نظر آجاتا ہے۔ وجہی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا اور دربار سرکار کے حالات سے خوب واقف تھا، اس واقفیت سے اس نے اپنی کتاب میں خوب کام لیا ہے مثلاً شہزادۂ دل کی خاطر اس نے شراب کے جواز کی تاویل میں جو نیم رندانہ نیم صوفیانہ تقریر کی ہے اس سے صاف درباری مصاحبت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ دشمن سے چوکسی، دوسروں سے رازداری، جاسوسی کا بیان کرتا ہے تو گویا اپنے زمانے کے واقعات اور خیالات کا چربہ اتارتا ہے۔

"سب رس" کی زبان سوا تین سو برس پہلے کی ہے اور وہ بھی دکن کی۔ بہت سے لفظ اور محاورات ایسے ہیں جو اب بالکل متروک ہیں اور خود اہل دکن بھی نہیں سمجھتے، اس لئے کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ لگا دی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ عربی فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ بھی کس کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک کام کی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض محاورات اُس وقت بھی بعینہ اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل۔ مثلاً شان نہ گمان، چیز کرنا، خالہ کا گھر، کہاں گنگا تیلی کہاں راجہ بھوج، گھر کے بھیدی لنکا جائے (گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے) شرم حضور کلم دکھا دیکھی، جائیں، بائیں کھیلنا، سونا ہور (اور) سگند، دودھ کا جلیا چاچھ پھونک پیتا، وغیرہ۔ اس سے الفاظ و محاورات کی تاریخ میں بہت مدد ملتی ہے۔ الفاظ و محاورات کے علاوہ اس کتاب سے قدیم دکنی یا اردو کی صرف و نحو اور بعض الفاظ کے تغیر و تبدل کا پتا بھی لگتا ہے اور اس کی صحیح کیفیت نثر ہی کی کتاب سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر چند

باتیں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) مذکر مونث دونوں کی جمع "اں" سے آتی ہے جیسے باتاں جھاڑاں کتاباں وغیرہ۔ بھائی کی جمع بھائیاں، غمزہ کی جمع غمزیاں وغیرہ

(۲) ایسے افعال متعدی جن کی ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی احتمالی کے ساتھ "نے" آتا ہے تو فعل ہر حالت میں مذکر ہی استعمال ہوتا ہے۔ خواہ فاعل مونث ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن دکنی میں مذکر کے لئے مذکر اور مونث کے لئے مونث فعل ہوتا ہے جیسے اس عورت نے کہی، لڑکی نے پانی پی۔

(۳) "نے" کا استعمال بہت بے قاعدہ ہے۔ اس حرف کے استعمال کے قواعد حال ہی میں منضبط ہوتے ہیں۔ میر و سودا کے زمانے میں بھی یہی بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔

(۴) فاعل اگر مونث جمع ہے تو اس فعل بھی جمع ہوگا۔ جیسے "اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دوسرے کوں اپنا حسن دیکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں، اپنے مرد کو ہر دو جہاں میں اپنا دین و ایمان کر پہچانتیاں ہیں"۔ شمالی ہند کی پرانی اردو میں بھی یہی استعمال تھا۔

(۵) مونث کی صورت میں حرف اضافت کی بھی جمع آتی ہے۔ جیسے دل کے فائدے کیاں بہت باتاں ہیں"۔

(۶) اسی طرح ایسی، جیسی، جتنی، کی جمع ایسیاں جیسیاں، جتنیاں آتی ہے۔

(۷) ایسے مصادر کی ماضی مطلق جن میں علامت مصدر سے قبل "ا" یا "و" نہیں ہوتا اس طرح بنتی ہے کہ امر کے آگے "ا" بڑھا دیتے ہیں جیسے دیکھنا سے دیکھا۔ لیکن دکنی میں بجائے "ا" کے "یا" لگاتے ہیں۔ جیسے دیکھیا، ملیا، پھریا وغیرہ

(۸) "سی" مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ علامت ہندوستان کی کئی زبانوں میں خفیف تغیر کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ جیسے "نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نا آسی"

(۹) "کر" کا استعمال۔ یہ میر امن کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسے "دانا ہنر ہنر کر جانے لگا"

(۱۰) ضمائر میں بھی کسی قدر تغیر پایا جاتا ہے یہ، وو (یہ اور وہ کی جگہ) انو (انھوں نے) انوکوں (ان کو) اُنو کا (اُن کا) ہمنا (ہم کو) جنوں (جنھوں نے) جنوں کو (جن کو) جنوں کا (جن کا) یہے (یہ کی جمع کے لئے)

(۱۱) الفاظ کے آخر میں "چ" تاکید کے لئے اکثر لگا دی جاتی ہے۔ جس کے معنی عموماً "ہی" کے ہوتے ہیں جیسے۔ "خدا منا کیا سو برے فعلانچ خاطر۔ یونچ (یونچہ) یار کوں یار کتے"۔

(۱۲) مانگنا بمعنی چاہنا۔ یہ استعمال اکثر انگریزوں کی زبان سے سنا گیا ہے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ انھیں کا ایجاد ہے۔ لیکن قدیم دکنی اُردو میں یہ لفظ انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزنے بھی اول اول مدراس سے سیکھا جیسے "اگر منگتا ہے دل میں محبت بھرے شراب پی۔ اگر کچھ انچا چڑنے منگتا ہے تو شراب پی"۔

(۱۳) الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی کچھ زیادہ خیال نہیں۔ مثلاً شراب، خبر، صورت، دنیا کو مذکر لکھا ہے۔

(۱۴) اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کر دیا ہے یعنی جس طرح بولتے ہیں ویسے ہی لکھ دیئے ہیں۔ جیسے نفع کو نفا، وضع کو وضا یا وزا، واقعہ کو واقا، منع کو منا، طمع کو طما، معاملہ کو مامِلہ، معنے کو مانا۔ چنانچہ طما (طمع) کا قافیہ جما اور مانا (معنی) کا کھانا لکھا ہے۔ ایک جگہ پیاس اور میراث کا قافیہ باندھا ہے۔ ایسا دکنی میں اکثر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں قافیہ کی بنیاد صوت پر ہے۔

(۱۵) اُردو کے جس لفظ دو ڈالیں یا ایک ڈا اور ٹ ہوتی ہے تو دکنی میں پہلی ڈال دال بولی جاتی ہے۔ جیسے ڈھونڈہ کو دھونڈہ، ڈانٹ کو دانٹ کہیں گے۔ یہ تلفظ اب بھی یوں ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دو "ڑ" یا دو "ٹ" ایک لفظ میں قریب قریب ہوتی ہیں تو وہاں بھی پہلی ڑے رے اور ٹے تے ہو جاتی ہے۔ جیسے کُھٹیا، مروڑ۔

(۱۶) اُردو میں اکثر الفاظ کا تکرار ہوتا ہے اور یہ تکرار خاص معنے پیدا کرتا ہے، جیسے گھر گھر، در در وغیرہ قدیم دکنی اُردو میں ان دو کے درمیان "ے" کا اضافہ کرتے

تھے جیسے گھرے گھر، درے در، ٹھارے ٹھار، رگے رگ وغیرہ۔ کبھی ے کی جگہ "ین" استعمال کرتے ہیں جیسے گھرین گھر۔

میں اس ضمن میں یہ لکھنا بھول گیا کہ دکن کے چار اور شاعروں نے بھی اس قصّے کو اپنی زبان میں لکھا ہے اور چاروں منظوم ہیں۔ ایک تو "ذوقی" ہیں جن کا نام شاہ حسین اور لقب "بحر العرفان" ہے۔ انھوں نے حسن و دل کو سنہ ۱۱۰۹ھ میں نظم کیا اور "وصال العاشقین" نام رکھا۔ دوسرے "مجرمی" شاہ بیر اللہ ہیں جو بیجاپور کے رہنے والے تھے، انھوں نے اپنی مثنوی سنہ ۱۰۸۶ھ میں نظم کی اس کا نام "گلشن حسن و دل" ہے۔ یہ دونوں وجہی کے خوشہ چیں معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ انھوں نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ ان دونوں کا ذکر میں الگ کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو "اردو" جلد پنجم صفحہ ۴۹۹ و صفحہ ۵۰۲)۔

سید محمد ولی اللہ قادری ساکن حیدرآباد نے ایک مثنوی چار سو پچاس بیت کی سب رس کے نام سے لکھی ہے۔ شروع کے تین شعروں میں حمد و نعت لکھ کر پرت (یعنی محبت) کی تعریف میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

اتا میری سنو یک بات یاراں — تپستاں ہو چکیں آیا تھا باراں
مویاں کوں پھر جلایا تھا خدا نے — ہوئی تھی قادری سب جا پچھانے
ہر یک سبزا ثنا اپنے خدا کی — کھڑا کرتا اتھا ہر یک رضا کی
ہوا یو واقعہ شہر بدن میں — اتھا میں اُس وقت ملک دکن میں

یہ تماشا دیکھتا چلا جاتا تھا کہ ایک نورانی صورت نظر آئی۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو کہا میرا نام "سب رس" ہے، کیونکہ مجھ میں طرح طرح کے ہزاروں رس بھرے ہیں۔ وہ مجھ سے بڑی مہربانی اور شیریں زبانی سے باتیں کرتی رہی اور کہا کہ میں آج تجھے وہ چیز دیتی ہوں جو اب تک کسی نہیں دی۔

رکھی ہوں چیز یک من میں چھپا کر — کہ جیوں رکھتے خزینہ نا دکھا کر
اجھوں لگ میں کسی کو نیں دئی ہوں — مگر تیری نذر دو میں کرتی ہوں

عطا کرتی ہوں تجھ پر لے ادب ار | دسیا جو تو مجھے اس کا خریدار
وو سو ہے راز میرے سب جنم کی | حکایت ہے مری شادی و غم کی
عجائب پُر نزاکت ہے حکایت | سلوک ہے ہور مجازی ہور حقیقت
ولی یو بات تو جس کو سنا وے | ہنساوے کئیں اسے کئیں تو رولا دے
توں اس قصے کو میرا ناؤں کہناں | دیا رکھ ناؤں اس کا جان جاناں

یہ روح ناطقہ ہے اور اپنی ساری سرگزشت سناتی ہے کہ میں کس طرح ملک عدم سے شہر بدن میں آئی اور یہاں مجھ پر کیا گذری اور مکروہات دنیا میں پھنس کر عیش و عشرت او غفلت میں پڑ گئی اور اپنی اصل کو اور وعدوں کو بھول گئی اور اپنے پیا (مالک) سے دور ہو گئی جب حالت بہت گر گئی تو اس طرف سے بیم و رجا کے فرشتے میری ہدایت کو بھیجے گئے پھر میں غفلت سے بیدار اور اپنے کئے سے پشیمان ہوئی اور اپنے اصل پیا کی طرف رجوع کی بغرض مصنف نے اس مختصر مثنوی میں اس سرگزشت کو بیان کیا ہے جو روح پر اصل سے جدا ہو کر انسانی جسم میں داخل ہونے سے گزرتی ہے۔

اگرچہ خیال وجہی کی سب رس کے قصے سے جُدا ہے لیکن ہے ماخوذ اسی سے وجہی کی سب رس کا اس میں کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ نظم معمولی ہے۔ کتابت سنہ ۱۱۰۸ھ کی ہے جو تصنیف کے قریب کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔

دکنی اردو کی ایک اور مثنوی "حسن و دل" کے نام سے لکھی گئی ہے اس میں پورا قصہ وہی ہے جو وجہی کی سب رس میں ہے۔ کہیں کہیں خفیف سا تغیر کیا گیا ہے۔ وجہی نے جو اپنی کتاب میں جگہ جگہ وعظ و نصائح کا دفتر کھولا ہے وہ اس مثنوی کے مصنف نے حذف کر دیا ہے اور سادہ قصہ بیان کر دیا ہے۔

ابتدا میں حمد و نعت میں صرف تین شعر ہیں۔ اس کے بعد قصہ شروع کر دیا ہے۔ میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں مگر افسوس کہ دونوں آخر سے ناقص ہیں۔ یعنی صرف چند ورق نہیں اس لئے اس کے مصنف کا نام وغیرہ نہ معلوم ہو سکا۔ زبان اس کی صاف ہے مگر کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ دونوں مثنویاں بارھویں صدی کے اواخر کی لکھی ہوئی

معلوم ہوتی ہیں۔

یہ چاروں مثنویاں دکنی شاعروں کی تصنیف ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور مثنوی "حسن ودل" کے نام سے خواجہ خیرالدین المتخلص بہ خواجہ کی تصنیف ہے۔ یہ ہندستان (شمالی بھارت) کے رہنے والے تھے۔ اُن کی زبان اس کی صاف گواہی دے رہی ہے۔ علاوہ اس کے اپنی نظموں اور قصیدوں میں اپنے آقا سے وطن جانے کی اجازت کی طلب کی ہے۔ حیدرآباد دکن میں آکر مقیم ہو گئے ہیں اور نواب میر منور علی خاں منورالدولہ منورالملک فرزند سکندر جاہ بہادر کے متوسلین میں سے ہیں چنانچہ اپنی ایک غزل میں لکھتے ہیں۔

معیں ہو یا معین الدین چشتی ۔۔۔ یہ خواجہ عازم ہندوستاں ہے

اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

دکن سے ہند میں مجھ کو بلا لو ۔۔۔ مرا جاتا ہوں یا مرشد بچالو

یا اپنے آقا سے مثنوی کے صلے میں یہ عرض کرتا ہے کہ مجھے خوشی خوشی وطن (ہندستان) کی اجازت فرمائی جائے۔ حمد و مناجات، نعت، منقبت تقریباً پندرہ صفحہ پر ہے اور بیچ بیچ میں مخمس اور مسدس اور مثلث بھی آگئے ہیں۔ اس کے بعد عشق کی شان میں نغمہ سرائی کی ہے۔ اپنے مرشد اور صوفیوں کی ثنا و صفت میں بہت کچھ لکھا ہے اس سے فارغ ہو کر اس نے بادشاہ دکن نواب ناصرالدولہ بہادر اور اپنے آقا نواب میر منور علی خاں کی مدح اور سبب تالیف کتاب کے بیان میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے نواب صاحب کی فرمائش پر خواجہ صاحب نے یہ مثنوی لکھنی شروع کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں

طبیعت تھی جو از بس عاشقانہ ۔۔۔ لکھا ہوں حسنؔ و دل کا یہ فسانہ

اگرچہ پیش ازیں اس داستاں کو ۔۔۔ لکھے دکھنی میں اُستادانِ خوش گو

خصوصاً شیخ ابراہیم ذوقی[۱] ۔۔۔ کئے ہیں کیا ہی موزوں مو بشوقی

---

[۱] تعجب ہے کہ خواجہ نے ذوقی کا نام شیخ ابراہیم لکھا ہے۔

لکھے ہیں نثر میں وجدی نے اس کو | پہ یہ دونوں کی ہے فہمید کس کو
مگر اب تک تو ہندی میں کبھی ہم | نہیں دیکھی کہیں واللہ اعلم

چوتھے شعر میں غلطی سے وجہی کی جگہ وجدی لکھ دیا ہے۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اپنا نام بھی بتا دیا ہے۔

دعائے خواجہ خیرالدین مسکیں | الہ العالمیں سو بار آمیں

یہ سب بیان ۷۸ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد "آغاز داستان" کا عنوان ہے قصے کی روداد وہی ہے جو وجہی کی سب رس میں ہے۔ البتہ کہیں کہیں تفصیلات میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً جب عقل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا فرزند دل حسن کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے اور حالت خراب ہے تو صبر کا مشورہ قبول کر کے وہ بادشاہ عشق کے نام ایک نامہ روانہ کرتا ہے اور اس میں حسن اور دل کے عقد کی خواستگاری کرتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ نامہ منزل مقصود پر پہنچے اور کوئی جواب آئے بادشاہ کے مصاحب فراست نے کہا کہ صبر نے جو تدبیر بتائی ہے وہ ہے تو اچھی اور مناسب موقع لیکن اگر اس عرصہ میں شہزادہ کی حالت فراقِ حسن میں خدانخواستہ کچھ اور ہو گئی تو پھر کوئی چارہ کارگر نہ ہوگا۔ لہذا یہ معاملہ تلوار ہی سے طے ہونا چاہئے۔ وہم نے بھی اس کی تائید کی۔ چنانچہ لشکر کشی کی تیاری شروع ہو گئی۔

وجہی نے دل کے والد کا ذکر نہیں کیا لیکن اس مثنوی میں شروع میں ایک جگہ والد کا بھی ذکر آ گیا ہے اس طرح اس مثنوی میں بادشاہ عشق کے وزیر کا نام مہر لکھا ہے اور فوج کے سرداروں کے نام مشقت خاں، محنت بیگ خاں قزلباش، حسرت خان بہادر افغان، شیخ استغنا وغیرہ تجویز کئے ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں۔

جس طرح وجہی نے اپنے قصے میں جگہ جگہ وعظ و پند کے طومار سے کتاب کا حجم بڑھا دیا ہے اسی طرح خواجہ صاحب نے بھی موقع بے موقع غزلیں، مخمس، مسدس، مثلث، مسبع اور تضمین لکھ کر کتاب کو طویل بنانے میں کمی نہیں کی۔ مگر ان کی زبان بہت صاف اور اچھی ہے۔ عاشقانہ مضامین خوب لکھتے ہیں۔ بہت پُر گو اور خوش گو ہیں۔ لکھنے پر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں کہیں رکتے نہیں۔ کلام میں آمد ہے۔ کتاب سنہ ۱۲۶۴ھ کی تصنیف ہے۔

سب رس منظوم

(۱) وصال العاشقین مصنفۂ سید شاہ حسین ذوقی

(۲) گلشن حسن و دل مصنفۂ مجرمی

ہم رسالۂ اردو کے نمبر ۱۶ بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں ملا وجہی کی کتاب سب رس پر مفصل تبصرہ لکھ چکے ہیں۔ اسی ضمن میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ کتاب کا مضمون اور طرز بیان ایسا ہے کہ یہ ضرور اپنے زمانے میں مقبول ہوگی اور لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہوں گے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اسی قصے کے دو منظوم نسخے جو دو مختلف شخصوں نے قریب قریب زمانوں میں نظم کئے ہیں ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب کا نام وصال العاشقین ہے اور حسن و دل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کتاب کے مصنف شاہ حسین ذوقی ہیں جن کا لقب بحر العرفان ہے اور یہ اُن کے مرشد (شاہ خان محمد) کا عطا کیا ہوا ہے چنانچہ اسی کتاب میں اپنے مرشد کی منقبت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

کرم سوں دی مرے دل کوں طغیاں　　　رکھیا پھر ناؤں ہے مجھ بحر العرفاں

ذوقی درویش منش اور متوکل شخص تھے۔ ان کا زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے چنانچہ کتاب کے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں اس کا کیا کروں کوئی بادشاہ

یا شہنشاہ میرے شعر کی داد دینے والا نہیں ہے۔

کردں کیا جو کہیں کے نین شہنشاہ   شعر کا داد مجھ دیتے بلند جاہ

دلی کا بادشاہ ہے سو وہ ایسی عیش کی چیزوں کی طرف مائل نہیں دوسرے میرے شعر کی بھی وہاں تک کہاں رسائی تھی اور میری یہ قسمت کہاں تھی کہ میں اسے اپنا کلام سناتا۔ اگر بادشاہ مال مست ہے تو فقیر حال مست ہے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے بادشاہ کے عہد میں پیدا کیا اور اس کے بعد بادشاہ کی تعریف میں چند شعر لکھے ہیں۔

شہنشاہ نیک جو بیچپن ملوک کا   بڑا عادل بڑا دھرمی سلوک کا

جو ہے اس وقت اورنگ زیب عالی   نبی کی شرع کے گلشن کا مالی

بہادے نام عالم گیر اُسکوں   گنا لازم ہے جگ کا پیر اُسکوں۔ وغیرہ

کتاب کی تاریخ میں مصرعہ لکھا ہے:۔

حسین ذوقی کہا ہے نیک جلوہ

اس سے سنہ ۱۱۰۹ ہجری نکلتے ہیں۔ یعنی یہ کتاب سب رس سے تقریباً پینسٹھ برس بعد لکھی گئی ہے اس کا ذکر وہ اپنی کتاب میں بھی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی نظم لکھوں جو شگفتہ ہو اور یادگار رہے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی کام کی بات ہاتھ نہ لگی۔ آخر اس طرف توجہ کی۔

مگر اے حسن و دل کا خوش سرشتہ   لبھایا من کوں میرے ہو فرشتہ

گرچہ اسے سرشتہ لے اول بھی   گندے ہیں ہار ملاں شیخ وجہی

رکھے ہیں ہار کا تس ناوں سب رس   ولیکن اے سرشتہ نیں کتا بس

ہوا کیا جو انو یک تار لے کر   گندے اپنے موافق ہار لے کر

ذوقی نے یہاں تعلی کی ہے اگرچہ اس نے یہ کتاب نظم میں لکھی ہے لیکن وجہی کی سب رس کو نہیں پہنچتی۔ وجہی کی نثر میں جو لطف ہے وہ اس کی نظم میں نہیں۔ ذوقی نے بھی اخلاق و دین اور تصوف کی اصطلاحات کا خوب استعمال کیا ہے اور شروع میں تو اس قدر بوچھاڑ کی ہے کہ پڑھنے والا گھبرا جاتا ہے لیکن آگے چل کر یہ جوش کم ہوجاتا ہے۔ بلکہ بعض

مقام پر وہ اس تلازمے کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ قصے میں بھی سب رس سے کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ اختلاف بالکل جزوی ہے۔ لڑائی کا بیان خوب لکھا ہے اور ہتیار بھی وہی استعمال کئے ہیں جو حسن و دل کے مناسب ہیں۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آئے تو لکھتے ہیں۔

ہوئے جو بہار دونوں مل مقابل   پڑیا لرزا ہیں اسمان کے در دل
زمیں ہدری ابر گرجیا فلک ڈہل   اوبل دریا ڈوبے پہاڑاں ھمک تل

ہماری رائے میں سب رس میں اس قصے کو بہتر نبھایا ہے۔

ذوقی دکھن کے مشہور مصنف اور شاعر ہیں اس نظم میں انھوں نے اپنی تصنیفات کو گنوایا ہے۔ ایک تو حضرت غوث الاعظم کی منقبت میں ہے دوسری وفات رسول اور معراج میں، تیسری منصور کا قصہ اور چوتھی ماباپ نامہ۔ یہ نام گنوانے کے بعد لکھتے ہیں۔

ہنوز بند نیں طبیعت ہے ابلتا   سمندسے حوض کا جوں یم ہو چلتا

میرے پاس ذوقی کے ایک مرید اور شاگرد احد نامی کی بھی ایک تصنیف ہے جس کا نام غم نامہ (یا شہادت نامہ) ہے۔ اس میں شہادتِ امام حسین کا ذکر ہے اس کتاب میں مصنف جگہ جگہ ذوقی کے احسانات کا ذکر کرتا ہے افسوس ہے کہ شروع کے چند ورق غائب ہیں ورنہ اس سے ذوقی کے حالات کا کچھ نہ کچھ ضرور پتہ لگتا۔ یہ نسخہ جو میرے پاس ہے خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں جو نوحہ لکھا ہے اس میں سنہ تصنیف ۱۱۵۵ ہجری بتایا ہے۔ ذوقی نے علاوہ ان مثنویوں کے غزلیں وغیرہ بھی کہی ہیں اور ان کا ایک مجموعہ میرے پاس بھی ہے۔ طوالت کے ڈر سے صرف نمونے کے طور پر دو چار شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ہے سرو قد سکی کا جوں پھول ڈال نازک   مکھ پھول پھل رہیا ہے جیسا گلال نازک
مکھ پھول[1] نار کی سوں ڈالی پو پھل رہیا ہے   پہنکڑیاں سو پھول کیاں جیتیں ہیں گال نازک
چٹے[2] کھا کہ ناز کی سوں لٹکے سکی اگن میں   گویا لباں شفق میں دستے ہلال نازک

۱؎ گل انار ۲؎ پان

مخمس

انکھیاں نس[۱] دن پھڑکتیاں ہیں سجن دیدار دیکھن کوں
رہیاں نہیں چلن سوں ایک تل تڑپتیاں ہیں کسی لکھن کوں
الس دل کے صحیفے پر خوبی تجھ حسن لیکھن کوں
اندھالے مکھ نت اوٹھ آوں تمہارے درس[۲] دیکھن کوں
جیسے بت پوجنے کارن فجر کوں برہمن نکلے

*

۲۔ گلشن حسن دل

یہ بھی سب رس ہی کا قصہ ہے جو نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف مجرمی ہیں۔ مجرمی تخلص ہے۔ اصل نام شاہ بیر اللہ ہے جیساکہ وہ خود ہی کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں۔

اِس عاجز کا ناؤں شاہ بیر اللہ فقیر — جو سید میراں اس کا ہے دستگیر

رہنے والے بیجاپور کے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ لکھتے ہیں کہ میں نے اس قصے کو حمید الدین سامانی کے روضے میں اختتام کو پہنچایا۔ حضرت شیخ حمید قادری کا روضہ بیجاپور میں ہے اور یہ سندھ سے احمد آباد اور بیدر میں وارد ہوئے اور وہاں سے بیجاپور پہنچے اور وہیں انتقال فرمایا۔

دو سال کا عرصہ ہوا کہ فارسی زبان میں تقریباً ایک جز کا رسالہ میرے ہاتھ لگا جس میں حسن و دل کا قصہ تھا۔ مصنف یا کاتب کا کہیں نام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اصل فارسی کتاب کا خلاصہ ہے گلشن حسن و دل سے اصل فارسی کتاب کا پتہ لگتا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

دیکھو حسن دل فارسی کا دھنی — یو سید محمد ہے یوسف الحسینی
بھی دکھنی زباں سوں لیا کھیا نظم میں — جو کہیا نہیں ہوں بجز حکم میں

۱؎ رات ۲؎ درشن

فارسی میں اس کا نام حسن دل تھا مگر انھوں نے اپنی نظم کا نام گلشن حسن دل رکھا۔ اس کا اشارہ بھی کیا ہے۔

جو قصہ اتھا فارسی بے بدل | کہ تھا نام اس کا حسن دل اصل
میرے دل میں آیا اتھا ایک خیال | کہوں ایک قصہ حسن بے مثال
جو قصے کا تھا نام اول حسن دل | رکھیا نام دکھنی گلشن حسن دل

مجرمی کا زمانہ بھی وہی ہے جو شاہ حسین ذوقی کا ہے گویا دونوں ہم عصر ہیں اور یہ دونوں کتابیں بھی ایک ہی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے خود ہی سنہ تصنیف بتا دیا ہے۔

یو باروے صدی میں یو قصہ تمام | جو چودا برس نیں ہوے تھے تمام

یعنی اس حساب سے سنہ ۱۱۱۴ ہجری تصنیف کا سال ہوا۔

مجرمی نے قصے کو بہت مختصر کر دیا ہے اور نظم بھی صاف اور بہت معمولی ہے۔ نمونے کے لئے دو ایک مقام سے کچھ اشعار دیئے جاتے ہیں۔ کتاب شروع یوں کی ہے۔

جتا حمد ہے سو خدا کو پچ ہے | ثنا ہور صفت بھی اُسی کو پچ ہے
جو درگاہ اس کی اہے بے نیاز | اپس سوں اہیں ہے وہ بے نیاز
نہ قادر ہے قدرت میں اس سار[۱] کا | نہ پیدا کیا ہے اپس سار کا
سزا وار ہے اُس کے تئیں یک پناں[۲] | جو کوئی حق کوں بوجیا اسی یک پناں

قصہ یوں شروع کیا ہے۔

زباں ہور نظر دونوں مل یار ہو | چلے ہیں تماشے کو ایک ٹھار ہو
چلے جب تماشے کو ملکے[۳] ملوک | تو دیکھتے تمیز کر کو کرتے سلوک
سلوک سوں ہر ایک ملک کا لے خبر | تو واقف ہو پھرتے تھے کرتے نظر
کتے ہیں ولایت کو آئے دو نو | عجائب شہر ایک پائے انو[۴]

(رسالہ "اُردو" جولائی ۱۹۲۵ء)

۱۔ مانند ۲۔ واحد ہونا۔ ایک ہونا ۳۔ ملک ملک ۴۔ انھوں نے